Regd. L. No.7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1972

اس پرچہ میں

بھٹو ۔ اندرا مذاکرات

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ ۔ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

ٹیلی فون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵- بی گلبرگ لاہور

بدل اشتراک
پاکستان
سالانہ ـــــ دس روپے
غیر ممالک
سالانہ ـــــ ایک پونڈ

جلد (۲۵) | جولائی ۱۹۷۲ء | نمبر (۷)

فہرست

۱- لمعات ـــــ ۲
۲- حقائق و عبر ـــــ ۱۴
۳- پاکستان کے متعلق خدائی فیصلہ (۲) ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۱۶
۴- اللہ دین کا جن ـــــ ۳۳
۵- مسئلہ تعلیم اور طلوعِ اسلام ـــــ (محترم محمد اسلام صاحب) ـــــ ۴۵
۶- دیارِ عرب اور عوامی حکومت ـــــ (شاہد عادل) ـــــ ۵۷
۷- طلوعِ اسلام کا ٹرسٹ فنڈ ـــــ (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)) ـــــ ۶۳

مدیر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵- بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبع اشرف پریس [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بھٹو - اندرا مذاکرات

آجکل سارے ملک کی نگاہیں ان مذاکرات پر مرکوز ہیں جو ۲۸ جون کو صدر بھٹو اور بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے مابین ہونے قرار پائے ہیں۔ ہم تو ان مذاکرات کو چنداں اہمیت نہیں دیتے، کیونکہ

ہم جانتے ہیں جو وہ کہیں گے جواب میں

لیکن چونکہ یہ ہماری مستقبل کی تاریخ میں ایک اہم جزء بننے والے ہیں' اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس باب میں ہمارے تاثرات بھی صفحۂ قرطاس پر آجائیں اور محفوظ رہیں۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جس قوم کے نمائندگان کے ساتھ گفت و شنید کے لئے صدر بھٹو انڈیا جارہے ہیں' اس قوم کی ذہنیت کس قسم کی ہے۔ طلوع اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں پرویز صاحب نے ایک خطاب پیش کیا تھا جس کا عنوان تھا — ہندو کیا ہے[1] — اس میں انہوں نے علاوہ دیگر امور، یہ بتایا تھا کہ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے۔ نام تو اس کا چانکیہ تھا لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا۔ اور ہندو بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیہ کے معنی ہیں مکار اور فریب کار۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ وہ ذات شریف کیسے تھے اور ان کی متبع قوم کی ذہنیت کس قسم کی ہے۔ اس نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہے "ارتھ شاستر" اس میں سیاست کے چند بنیادی اصول دیئے گئے ہیں جو قابلِ غور ہیں۔

پہلا اصول:- حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول:- ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔

تیسرا اصول:- غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

چوتھا اصول:- جن سے دوستی رکھی جائے اس میں بھی ہمیشہ اپنی غرض پیش نظر رہے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا جائے۔

پانچواں اصول:- دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہر پہلو سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔ جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے۔ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔

چھٹا اصول:- دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پراپیگنڈہ، تخریبی کارروائیوں اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی

---

[1] یہ خطاب اب ان کی کتاب "قائداعظم کے تصور کا پاکستان" میں شائع ہو گیا ہے۔

جائے۔ وہاں اپنے آدمی ناجائز طریق سے داخل کر کے نظم و نسق کا عملہ بنایا جائے اور یہ سب کچھ مسلسل اندازے سے کیا جائے۔

ساتواں اصول :- رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے اور دوسرے ملکوں کے آدمیوں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول :- اس کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں سیاست کے وہ اصول جو اس کی ایک قدیم زمانہ کے مہاتما نے انہیں دیئے۔ اس کے بعد زمانہ جدید میں بھی ان کے ہاں ایک مہاتما (گاندھی) پیدا ہوئے جن کے ساتھ قائد اعظمؒ کو واسطہ پڑتا تھا۔ وہ "مہاتما گاندھی" کس قسم کے تھے؛ اس کا اندازہ قائد اعظمؒ کے ان الفاظ سے لگایئے جو انہوں نے اسی قسم کے مذاکرات کے تجربہ کے بعد تنگ آ کر کہے تھے۔ انہوں نے اگست ۱۹۴۴ء میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی کے) مقصد مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے بھی نمائندے نہیں۔ وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن بھرت رکھ لیتے ہیں جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ جو کچھ وہ زبان سے کہتے ہیں ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ کہیئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں۔ ایک معمہ ہیں۔!

اور اب انہی کی "چیلی" سے صدر بھٹو کا واسطہ پڑ رہا ہے ــــ صدر بھٹو! ــ تیرا اللہ رکھوالا !!

اُدھر یہ کیفیت اور ادھر یہ عالم کہ قوم سر تا پا جذباتی بگولہ بن رہی ہے۔ ہماری قوم کچھ طبعاً شعلہ مزاج تھی۔ اس پر گزشتہ چند سالوں کی سیاست نے جو اس پر تیل چھڑکا تو یوں سمجھئے کہ یہ کریلا نیم چڑھا ہو گیا۔ اب یہ اس قابل ہی نہیں رہی کہ کسی اہم سے اہم معاملہ کے متعلق بھی سنجیدگی سے غور و فکر کر سکے۔ کسی معاملہ پر غور و فکر کرنا تو ایک طرف ہماری نئی نسل کے نزدیک غور و فکر سرے سے ہے ہی کارِ بے کاراں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عمارت کی بنیاد بالکل بے مصرف ہوتی ہے کیونکہ وہ رہنے سہنے کے کام نہیں آتی۔ اس پر وقت، توانائی، اور پیسہ صرف کرنا بے کار ہے۔ بنیادیں بنانا قدامت پرستی ہے۔ رجعت پسندی ہے۔ اصل کام عمارت کی تعمیر ہے۔ ترقی پسندی کا یہی تقاضا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کو اس مقام تک پہنچا دیا گیا ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی معاملہ میں غور و فکر سے کسی نتیجہ پر پہنچ سکے گی، عبث ہے۔ یوں کہنے کو تو اب "سلطانیٔ جمہور" کا زمانہ آ چکا ہے، لیکن جمہور کی سلطانی کا دائرہ کار بس اتنا ہی ہے کہ جو مجمع تقریر سننے کے لئے اکٹھا ہو جائے اس سے پوچھ لیا جائے کہ ہم فلاں ملک سے معاہدہ کرنا چاہتے ہیں، تمہیں منظور ہے۔ اور وہ بیک زبان کہہ دیں کہ ہاں منظور ہے۔ مجوزہ مذاکرات میں جو مسائل زیرِ بحث آنے والے ہیں ان کے نتائج و عواقب بڑے دور رس ہیں لیکن ملک میں ان پر "غور و فکر" کچھ اسی نہج سے ہو رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس نقار خانہ میں "طلوعِ اسلام" کی پکار طوطی کی آواز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لیکن طوطی نے تو بہرحال اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ بالفاظ اقبالؒ ؎

برآور ہر چہ اندر سینہ داری ÷ سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

(۱)

جیسا کہ معلوم ہے مجوزہ مذاکرات میں حسب ذیل مسائل کے زیر بحث آنے کی توقع ہے۔

(۱) "بنگلہ دیش" کا تسلیم کیا جانا۔

(۲) جنگی قیدیوں کی واپسی۔

(۳) فوجوں کا قبل از جنگ کی سرحدات پر لوٹ جانا۔ اور

(۴) مسئلہ کشمیر۔

ہندوستان کی طرف سے اور کیا کیا مسائل سامنے لائے جائیں گے (یا یوں کہئے کہ مطالبات پیش کئے جائیں گے) اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ان مسائل میں سرفہرست بنگلہ دیش کا سوال ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ ایسا تھا ہی نہیں جسے موضوع گفتگو بنایا جاتا۔ کیونکہ کسی مملکت کے تسلیم یا نہ تسلیم کرنے کا سوال ایک آزاد مملکت کے اپنے فیصلہ پر موقوف ہوتا ہے۔ کسی دوسری مملکت کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس سوال کو موضوع گفتگو قرار دے۔ لیکن انڈیا اس مسئلہ کو موضوع گفتگو ہی قرار نہیں دیتا، وہ اسے باقی تمام مسائل پر گفتگو کرنے کی شرط اولین یا محور قرار دیتا ہے۔ اس سے اس کی نیت کا پتہ چل سکتا ہے۔ جہاں تک ہمارے ہاں کا تعلق ہے اس مسئلہ پر باتیں تو کئی ماہ سے ہو رہی ہیں۔ بہت سے سیمینار منعقد ہوئے۔ مذاکرات ہوئے۔ تقاریر ہوئیں مقالات لکھے گئے۔ لیکن آج تک تفصیلی طور پر کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اس مسئلہ کے عملی نتائج کیا ہوں گے یعنی اگر ہم نے "بنگلہ دیش" کو تسلیم کر لیا تو اس سے ہمیں کیا نقصانات پہنچیں گے اور اگر تسلیم نہ کیا تو اس سے ہمارا کیا فائدہ ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک قوم کو ان امور کا علم نہ ہو وہ ایسے اہم مسئلہ کے متعلق کوئی صائب رائے کس طرح دے سکتی ہے؟ لیکن یہاں ہو یہ رہا ہے کہ ان نتائج و عواقب کا کسی کو علم نہیں اور رائے ہر شخص دے رہا ہے۔ یا اس سے کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنی رائے سے ملک کو نوازے۔ اس سلسلہ میں جس قدر گفتگو سننے میں آ رہی ہے وہ سب جذبات پر مبنی ہے۔ حقائق پر نہیں۔ اور ان جذبات میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرنے سے نظریۂ پاکستان کی نفی ہو جاتی ہے۔ دو قومی نظریہ کی شکست ہو جاتی ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس سوال کا نظریۂ پاکستان یا دو قومی نظریہ سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں!

پہلے نظریۂ پاکستان کو لیجئے۔ ہم اپنی اس بدبختی اور فطرت کی ستم ظریفی کا رونا بار بار رو چکے ہیں کہ جس نظریہ پر اس مملکت کی بنیاد ہے، اس کا آج تک کوئی مفہوم ہی متعین نہیں کیا گیا۔ یہ اصطلاح دہرائی تو اس طرح جاتی ہے کہ جیسے تسبیح پر کوئی ورد کیا جاتا ہو، لیکن معانی سے یہ اصطلاح اسی طرح بیگانہ ہے جس طرح "کاتبِ علم" کے الفاظ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اصطلاح کا مفہوم متعین کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ چار لفظوں میں اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ:

مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلام زندگی کا عملی نظام نہیں بن سکتا۔

ہندوستان میں، مسلمانوں کے لئے الگ آزاد مملکت کے مطالبہ کی بنیاد یہی تھی کہ اس کے بغیر مسلمان اسلام کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ یہ ہے نظریۂ پاکستان۔

یہ نظریہ ایک ابدی صداقت (ETERNAL TRUTH) ہے اور ابدی صداقتیں اس کی محتاج نہیں

ہوتیں کہ کوئی انہیں مانے تو وہ صداقت سمجھی جائے اور نہ مانے تو وہ صداقت نہ رہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک ابدی صداقت ہے کہ "اسلام دینِ برحق ہے"۔ یہ اس دن بھی صداقت تھی جب ہنوز دنیا میں (نبی اکرمؐ کے سوا) کوئی مسلمان نہیں تھا۔ یعنی کسی نے ابھی اسے بطور صداقت قبول نہیں کیا تھا۔ اور اس دن بھی صداقت رہے گی اگر (بفرضِ محال) دنیا میں کوئی شخص بھی اس کا ماننے والا نہ رہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر آپ سوچئے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام کو چھوڑ کر ہندو مت اختیار کر لے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ اسلام دینِ برحق نہیں۔ کیا اس شخص کا اسلام سے الگ ہو جانا اس صداقت کی شکست قرار پا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کسی فرد، خاندان، قبیلہ، قوم، ملک یا مملکت کا اسلام قبول کر لینا، اسلام کے دینِ برحق ہونے کا ثبوت قرار پائے گا، نہ کسی کا اسلام ترک کر دینا اس صداقت کے باطل ہونے کی دلیل ہوگا۔

یا مثلاً۔ "سیرت کی پاکیزگی باعثِ شرفِ انسانیت ہے"۔ یہ ایک ابدی صداقت ہے۔ اگر کسی وقت کسی پاکیزہ سیرت انسان کے کیریکٹر میں کوئی لغزش پیدا ہو جائے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ صداقت جھوٹی ہے، وہ اس وقت بھی صداقت ہی رہے گی۔

اس سے بھی نیچے اتریئے۔ "سورج روشنی دیتا ہے"۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی آنکھیں بند کر لے یا (بفرضِ محال) دنیا کے تمام باشندے اندھے ہو جائیں، اور ان کے لئے روشنی کا وجود باقی نہ رہے، تو کیا اس سے اس حقیقت کا بطلان ہو جائے گا کہ "سورج روشنی دیتا ہے"؟

ان مثالوں کے بعد اب نظریۂ پاکستان کی طرف آیئے۔ یعنی اس نظریہ کی طرف کہ

"اسلام کے عملی نظام بننے کے لئے اپنی آزاد مملکت کا ہونا لابدی ہے"۔

یہ صداقت اس دن بھی صداقت تھی جب ہمیں اپنی آزاد مملکت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے اس نظریہ کے مطابق ایک آزاد مملکت کا مطالبہ کیا اور وہ مملکت حاصل کر لی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس مملکت کے مل جانے سے اس نظریہ کی صداقت ثابت ہو گئی۔ اور اگر ہم اپنی کوششوں میں ناکام رہ جاتے اور یہ مملکت حاصل نہ ہوتی تو اس نظریہ کا بطلان ہو جاتا۔ قطعاً نہیں۔ یہ نظریہ اس وقت بھی سچا رہتا۔ اب اگر اس مملکت کے دو حصے ہو گئے ہیں، اور ان میں سے ایک حصے نے کہہ دیا ہے کہ ہماری مملکت سیکولر ہوگی، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ نظریہ باطل تھا۔ وہ تو ایک حصہ پاکستان ہے۔ اگر (خدانخواستہ) یہ دوسرا حصہ بھی کل کو کہہ دے کہ ہم سیکولر حکومت قائم کریں گے تو نظریۂ پاکستان اس وقت بھی برحق رہے گا۔ ہم ہر روز کہتے رہتے ہیں کہ ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر نہیں کر رہے، ہم سچے مسلمان نہیں رہے۔ تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ اسلام دینِ برحق نہیں؟ اس سے بھی آگے بڑھیئے اور (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) یہ سمجھئے کہ ایک مسلمان مرتد ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے مرتد ہو جانے سے اسلام کے دینِ برحق ہونے کے دعویٰ کی صداقت پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا، تو مملکتِ پاکستان کے ایک حصے کے الگ ہو جانے سے نظریہ کس طرح متاثر ہو سکتا ہے؟

اور اب ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈالئے اور سوچئے کہ کیا ہم نے اس پچیس سال میں نظریۂ پاکستان کو عملاً متشکل بھی کیا ہے؟ نظریۂ پاکستان کی عملی تشکیل سے مراد تھی۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸)

جملہ امور کے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کرو۔

کیا اس قوم کے عدم تفکر کی اس سے زیادہ واضح مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے طرزِ عمل سے نظریۂ پاکستان کی مسلسل تکذیب کرتے چلے آ رہے ہیں اور اسے اس نظریہ کی شکست قرار نہیں دیتے۔ لیکن "بنگلہ دیش" کے ایشو پر یہ سوال لے کر بیٹھ گئے ہیں کہ اس سے نظریۂ پاکستان کا ابطال لازم آجائے گا۔!

نظریۂ پاکستان کی طرح "دو قومی نظریہ" بھی ایک ابدی صداقت ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے قومیت کا معیار۔ رنگ نسل۔ زبان۔ وطن یا مملکت کا اشتراک نہیں، ایمان (آئیڈیالوجی) کا اشتراک ہے۔ عملاً اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان (یعنی قرآنی آئیڈیالوجی کے ماننے والے) ایک قوم کے افراد ہیں، اور اس آئیڈیالوجی کے نہ ماننے والے، دوسری قوم کے افراد۔ اس اعتبار سے دنیا میں صرف دو قوموں کا وجود ہے — ایک قومِ مسلم۔ دوسری قوم غیر مسلم۔ اسے کہتے ہیں دو قومی نظریہ۔ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) یہ بھی ایک ابدی صداقت ہے۔ اگر مسلمان اس معیار کو چھوڑ کر نسل۔ زبان۔ وطن یا مملکت کے اشتراک کو معیارِ قومیت قرار دے لیں تو بھی اس نظریہ کی صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ایسے مسلمان قرآن کی ایک صداقت کے منحرف ہو جائینگے۔ وہ صداقت اپنی جگہ برقرار رہے گی۔

قبل از تقسیم ہندوؤں کا دعوےٰ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں، اور ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ وہاں کے مسلمان (قرآنی معیارِ قومیت کی رُو سے) غیر مسلموں سے الگ، منفرد، جداگانہ قوم ہیں۔ اسی معیارِ قومیت کی رُو سے ہم وہاں کے غیر مسلموں سے الگ ہو کر یہاں آئے تھے اور پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیا تھا۔ اب اگر اس کے ایک حصہ میں بسنے والے (بنگالیوں) نے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ اور مغربی پاکستان کے مسلمان، اشتراکِ ایمان کی بنا پر ایک قوم نہیں، بلکہ وہ جداگانہ نسل یا الگ وطن کی بنا پر، ان سے الگ قوم ہیں تو اس سے انہوں نے دین کی ایک ابدی صداقت سے انحراف کیا ہے، اس صداقت کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ذرا سوچئے کہ قرآنی معیارِ قومیت (یعنی ایمان کے اشتراک) کی رُو سے ہمیں اور افغانستان، ایران، عراق، شام، مصر، عرب وغیرہ کے مسلمانوں کو ایک قوم ہونا چاہیئے تھا لیکن یہ سب، نسل یا وطن کے اشتراک کی بنا پر الگ الگ قومیں بنے بیٹھے ہیں۔ اگر ان کے الگ الگ قوم بن جانے سے، دو قومی نظریہ کی صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، تو "بنگلہ دیش" والوں کے الگ قوم بن جانے سے، اس نظریہ کی صداقت کس طرح متاثر ہو جائے گی؟ "بنگلہ دیش" کی علیحدگی پر سب سے پہلے مسز اندرا گاندھی نے یہ نعرہ مسرت بلند کیا تھا کہ اس سے دو قومی نظریہ کا ابطال ہو گیا ہے۔ اور اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ یہاں بھی ہر گوشے سے اس کی صداقت پر بازگشت بلند ہونی شروع ہو گئی۔ اندرا گاندھی تو قابلِ معافی تھی کہ وہ قرآن کی ان گہرائیوں تک کیسے پہنچ سکتی تھی، یا یوں کہیئے کہ وہ از رہِ عداوت ایسا کہتی تھی۔ لیکن حیرت ہے ان مسلمانوں پر جو اس کی ہمنوائی میں وہی سُر الاپنے لگ گئے۔

اور آپ نے اپنے گریبان میں جو پہلے منہ ڈالا تھا، اسے اور نیچے لے جایئے اور سوچئے کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ہم نے یہاں کیا کیا۔ پھر سن لیجئے کہ دو قومی نظریہ یہ ہے کہ ایک ملک یا ایک مملکت میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں قرار پاتے، اس ملک یا مملکت میں بسنے والے غیر مسلم الگ قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ اسی دعویٰ کی بنا پر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا لیکن پاکستان بننے کے ساتھ ہی ہم نے اس نظریہ کو بالائے طاق رکھ دیا اور پاکستانی مسلمانوں

اور غیر مسلموں کو ایک قوم تسلیم کر لیا۔ عملاً ہم نے یہ کیا اور زبانی میاں مٹھو کی طرح دو قومی نظریہ کی رٹ لگاتے رہے اور لگا رہے ہیں۔ اس ستم کی خود فریب قوم بھی دنیا میں شاید ہی کہیں اور ملے۔

ایک طرف تو ہم نے دو قومی نظریہ سے اس طرح انحراف کیا اور دوسری طرف کوئی ایسا عملی قدم نہ اٹھایا جس سے پاکستان میں بسنے والے مسلمان۔ پٹھان۔ پنجابی۔ سندھی۔ بلوچی۔ بنگالی کی یکسر غیر اسلامی تفریق و تمیز کو چھوڑ کر صرف مسلمان کہلائیں اور اس طرح ایک قوم کے فرد بنیں۔ کیا یہ قیامت نہیں کہ پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم تو ایک قوم کے افراد ہوں اور مسلمان پٹھان۔ پنجابی۔ سندھی۔ بلوچی۔ بنگالی قلبی اور ذہنی اعتبار سے الگ الگ قومیں! اور اسکے بعد دعوے دو قومی نظریہ کا! ہم پوچھنا چاہتے ہیں "دو قومی نظریہ" کی رٹ لگانے والوں سے کہ پاکستان میں دو قومیں کہاں ہیں اور کونسی ہیں؟ اپنی حالت تو یہ اور شور مچایا جا رہا ہے کہ "بنگلہ دیش" کو تسلیم کر لینے سے دو قومی نظریہ کا ابطال ہو جائے گا۔

ہم پھر دہرا دیں کہ نظریہ پاکستان یا دو قومی نظریہ دین کی ابدی صداقتیں ہیں۔ لیکن ہم انہیں پچیس سال سے عملاً جھٹلا رہے ہیں۔ اگر اس سے ان کے صداقت ہونے پر کوئی حرف نہیں آیا، تو بنگلہ دیش کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے بھی ان پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ابدی صداقتیں اس کی محتاج نہیں ہوتیں کہ کوئی انہیں تسلیم کرے تو وہ صداقت رہیں اور اگر ان سے انحراف برتا جائے تو وہ صدق سے کذب بن جائیں۔ ابدی صداقتیں اپنے صادق ہونے کے لئے انسانوں کے اقرار یا انکار کی محتاج نہیں ہوتیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست — احتیاجِ روم و شام ادراکِ ماست

لہٰذا آپ "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کے سوال کا فیصلہ ملکی مفاد کی روشنی میں کیجئے۔ نظریۂ پاکستان یا دو قومی نظریہ کو درمیان میں نہ لائیے۔ اور اگر آپ کسی سے اس باب میں رائے لینی ہے تو اسے اس کی مضرتوں اور منفعتوں سے آگاہ کیجئے۔ جب رسولِ اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) اور مملکت میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا تھا کہ رسول تم سے کچھ چھپا کر نہیں رکھے گا۔ وہ ہر بات تمہیں بتا دیگا تاکہ تم ٹھیک ٹھیک مشورہ دے سکو۔ صحیح مشورہ یا صائب رائے وہی دے سکتا ہے جسے تمام احوال و کوائف کا علم ہو۔ ہم بھی رموزِ مملکت سے واقف نہیں اس لئے اس باب میں کوئی حتمی مشورہ نہیں دے سکتے۔ البتہ "بنگلہ دیش" کے تسلیم کرنے میں ہمیں دو ایک مہیب خطرات نظر آتے ہیں۔

مشرقی پاکستان مملکتِ پاکستان کا ایک صوبہ تھا۔ اس نے اپنے مرکز کے خلاف بغاوت کی۔ بیرونی طاقتوں نے اُسے امداد بہم پہنچائی۔ اور اس طرح اس نے اپنی الگ مملکت قائم کر لی۔ اگر ہم اسے ایک آزاد مملکت تسلیم کر لیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس صوبے کو اپنے مرکز کے خلاف بغاوت کا حق حاصل تھا اور بیرونی طاقتیں بھی اسے امداد دینے میں حق بجانب تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کو مجبوراً برداشت تو کیا جا سکتا ہے کہ بحالاتِ موجودہ اس کے سوا چارہ نہیں (ہم اس وقت "بنگلہ دیش" کو پھر سے مملکت پاکستان کا صوبہ کسی طرح بھی نہیں بنا سکتے) لیکن اس کے حقِ بغاوت اور بیرونی طاقتوں کی اس معاندانہ کو جائز تسلیم کر لینے سے ہم کہیں کے بھی نہیں رہتے۔

دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اگر ہم نے اسے تسلیم کر لیا تو اس سے ایک ایسی طرح پڑ جائے گی جس سے مغربی پاکستان کا جو

صوبہ چلا ہے گا، بیرونی طاقتوں کی مدد سے، مرکز سے الگ ہو جائے گا۔ اور "بنگلہ دیش" کی نظیر کی رُو سے ہمیں اُس کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس طرح ہو سکتا ہے بتدریج مملکتِ پاکستان کا وجود ہی ختم ہو جائے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہاں ایک اور سازش چلی آ رہی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مولانا بھاشانی نے ایک شوشہ چھوڑا تھا کہ ۱۹۴۰ء کے (مسلم لیگ کے) ریزولیوشن میں مشرق اور مغرب میں دو ریاستوں کا ذکر تھا۔ اسے ۱۹۴۶ء کی کنونشن نے بدل کر ایک ریاست کر دیا لیکن اُس کنونشن کے اس فیصلہ کی آئینی حیثیت کچھ نہیں تھی۔ اس لئے ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کے مطابق، مشرقی پاکستان کو ایک الگ آزاد ریاست ہونا چاہیئے۔ مولانا بھاشانی کے بعد اس مصرعہ کو مجیب الرحمٰن نے بھی اٹھایا اور اس کے بعض ہمنواؤں نے یہاں سے بھی اس کی تائید کی۔ اس کے بعد وہ خطۂ زمین بزور الگ ہو گیا اس لئے اس سلسلہ میں کسی آئینی بحث کی گنجائش نہ رہی۔ اِس وقت جبکہ "بنگلہ دیش" کے تسلیم کئے جانے، یا نہ کئے جانے کا سوال سرِ فہرست آ رہا ہے، اس نکتہ کو پھر ابھارا جا رہا ہے اور مقامِ صد حیرت ہے کہ اسے صدر بھٹو کی مرکزی کابینہ کے ایک وزیر، میر خورشید حسن صاحب لے کر آگے بڑھے ہیں۔ اگر اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت ہوتی تو ہم میر صاحب سے دریافت کرتے کہ اگر قول فیصل ۱۹۴۰ء کا ریزولیوشن تھا جس میں (بقول انکے) دو الگ الگ ریاستوں کا تصور دیا گیا تھا، تو

(۱) تقسیمِ ہند کی رُو سے صرف دو ریاستیں وجود میں آئی تھیں۔ ایک ہندوستان، دوسری پاکستان۔

(۲) قائداعظمؒ ایک ہی ریاست کے گورنر جنرل قرار پائے تھے۔

(۳) انہوں نے ایک ہی مجلس آئین ساز منتشکل فرمائی تھی اور ایک ہی مرکزی حکومت کا قیام عمل میں آیا تھا۔

(۴) اس کے بعد پچیس سال تک مسلسل اور متواتر، پاکستان ایک ہی ریاست رہا اور خود مشرقی پاکستان کے لیڈر اس ایک ریاست کے عمائد و ارکان بنے۔

اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یا تو ان حضرات نے اس نکتہ کو سمجھا ہی نہیں تھا کہ دراصل ریاستیں دو ہونی چاہئیں، ایک نہیں۔ اور اگر سمجھا تھا تو (معاف فرمایئے) یہ لوگ (قائداعظمؒ سمیت) قوم کو دھوکا دیتے رہے۔ کیا ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کو ابھارنے والے حضرات یہ بتائیں گے کہ ان کے نزدیک ان دونوں میں سے کون سی صورت امرِ واقعہ تھی؟

اور اگر حقیقت یہی تھی کہ پاکستان سے مقصود دو الگ الگ مملکتوں کا وجود تھا، تو ہمیں مجیب الرحمٰن اور دیگر بنگالی حضرات سے معافی مانگنی چاہیئے کہ ہم نے اتنے عرصہ تک انہیں ایک آزاد مملکت سے محروم رکھا اور اندرا گاندھی کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اس نے ہماری غلطی کی تلافی کرا دی۔ ذرا سوچئے کہ اگر مجوزہ مذاکرات میں، اندرا گاندھی نے یہ دلیل پیش کر دی تو بھٹو صاحب کے پاس اس کا جواب کیا ہو گا؟

ہم میر خورشید حسن صاحب (اور ان کے ہمنواؤں) کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ اگر "بنگلہ دیش" کے تسلیم کرنے کے حق میں ہیں، تو اس کے لئے کوئی اور دلیل پیش کریں۔ ایسی دلیل تو پیش نہ کریں کہ جو نہ وہ لغو، لیکن اس سے اندرا گاندھی ہمارے منہ پر ایسا تھپڑ رسید کر دے جس کی آواز اقوامِ عالم کے ایوانوں تک سے جا ٹکرائے۔!

ہمیں حیرت ہے کہ صدر بھٹو کو کس قسم کے مشیر میسر آتے ہیں!

―― (۱) ――

اب آیئے دوسرے سوال کی طرف — یعنی جنگی قیدیوں کی واپسی — ہندوستان کی طرف سے اس باب میں جو کچھ اس وقت تک کہا گیا ہے۔ اس سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ ان کی واپسی کو "بنگلہ دیش" کے تسلیم کرنے سے مشروط قرار دے رہے ہیں۔ جہاں تک ہمارے ان بھائیوں کا تعلق ہے جو ہندو جیسی تنگ نظر قوم کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہیں، وہ کونسی آنکھ ہے جو ان کے غم سے خونابہ فشاں، اور وہ کون سا دل ہے جو ان کے درد سے فگار نہیں لیکن اس باب میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر وہی ہے جس کا اظہار خود ان قیدیوں میں سے بعض نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے (اور خدا کی ہزار ہزار رحمتوں کا سایہ ہو ان پر جنہوں نے یہ کہا ہے) کہ مملکتِ پاکستان ہمارے مصائب و تکالیف کا کچھ خیال نہ کرے بلکہ فیصلہ اس حقیقت کی روشنی میں کرے کہ کون سا اقدام پاکستان کے لئے منفعت بخش ہے۔ اگر ہندوستان ہماری رہائی کے لئے ایسی شرائط عائد کرتا ہے جو پاکستان کے لئے باعثِ ذلت ہیں، تو ہمارا کچھ خیال نہ کرتے ہوئے ان شرائط کو مسترد کر دیجئے۔ ایک کیا ہماری ہزار جانیں بھی پاکستان پر قربان ہو جائیں تو ہم اُسے نفع کا سودا سمجھیں گے — پاکستان کے جیالو! کیا بات ہے تمہارے جذبۂ ایمان کی — حقیقت یہ ہے کہ اس مملکت کا وجود تمہارے ہی عزم و ہمت کا رہین ہے — لہٰذا، اس بات کا موازنہ بھی حکومتِ پاکستان ہی کر سکتی ہے کہ ہندوستان کی شرائط مان کر اپنے قیدیوں کو چھڑا لینا مملکت کے لئے مفید ہے یا ان شرائط کو مسترد کر دینا۔ قوم تو اسی صورت میں صحیح مشورہ دے سکتی ہے جب اُسے اس قسم کے نفع و نقصان کا علم ہو۔

ہندوستان اس باب میں کس قدر دباؤ ڈال رہا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ مذاکرات میں چند دن ہی باقی رہ گئے ہیں اور وہ اس قسم کی خبریں نشر کر رہا ہے کہ جنگی قیدیوں میں سے قریب ڈیڑھ سو "بنگلہ دیش" کے حوالے کئے جا رہے ہیں تاکہ وہ ان کے خلاف مقدمات چلا سکے۔

ہم مجبور ہی ہیں جو یہ سب کچھ سن رہے اور سہ رہے ہیں! ورنہ
کسی کی ہم نہیں سنتے تھے اِک وہ بھی زمانہ تھا۔

اب یہ احساس اور شدت سے ابھر کر سامنے آ رہا ہے کہ ہم نے مجیب کو افراتفری میں رہا کر کے کتنی بڑی غلطی کی۔ ہم حکومتِ پاکستان سے گذارش کریں گے کہ اب وہ کہیں یہ غلطی نہ کر بیٹھے کہ مغربی پاکستان میں رہنے والے "بنگالیوں کو غیر مشروط طور پر بنگلہ دیش" بھیج دینے پر رضامند ہو جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کے ساتھ (خدانخواستہ) کسی قسم کا نازیبا سلوک کیا جائے البتہ ان میں سے جن کے خلاف سازش یا غداری میں ملوث ہونے کا ثبوت ہو، ان کے خلاف مقدمات دائر کئے جائیں۔ وہ ہمارے شہری ہیں اور ہم ان کے خلاف اس قسم کے قانونی اقدامات کے لئے بالکل حق بجانب ہوں گے۔

——— (۰) ———

جہاں تک فوجوں کی واپسی کے سوال کا تعلق ہے، قوم کو کچھ معلوم نہیں کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہم نے بھارت کے کون کون سے علاقے اور اہم مقامات پر قبضہ کیا تھا، اور ہمارے کون کون سے علاقے اور مقامات ان کے قبضے میں ہیں۔ اگر سابقہ سرحدات کی طرف لوٹنے میں، بھارت کا فائدہ ہے تو ہمیں اس مسئلہ پر ان سے کچھ سودا کرنا چاہیئے یعنی اگر ہم نے اپنا مقبوضہ علاقہ انہیں واپس دینا ہو تو ہمیں ان سے اس کی قیمت لینی چاہیئے۔ "قیمت" کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ کسی اور گوشے میں ہم سے کوئی ناجائز مطالبہ کرتے ہیں تو ہمیں سرحدوں کے سوال پر دباؤ ڈال کر انہیں عدل و انصاف

کے سامنے جھکنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ اس تمام دستاویز میں ہمیں قرآن کریم کے اس ارشاد کو بہرحال پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا۔ (۵:۸) کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی راہ تقویٰ کی ہے۔ ہمیں دشمن کی زیادتی کی مدافعت تو کرنی چاہیئے، اس کے ساتھ زیادتی کبھی نہیں کرنی چاہیئے۔

(۷)

جہاں تک مسئلہ کشمیر کا تعلق ہے، ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ :-

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد!

بھارت نے صرف کشمیر کے معاملہ ہی میں دھاندلی نہیں کی، اور بھی کئی امور میں اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ لیکن ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ باقی رہی (UNO) سو اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ کسی کمزور مظلوم کی مدد کرے گی خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ گذشتہ تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ حکیم الامت نے جو ایک عرصہ ہوا کہا تھا کہ

من از بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند!

تو وہ حرفاً حرفاً صحیح تھا۔ ہم نے کشمیری مظلوموں کی امداد اپنے اوپر فرض قرار دی تھی۔ لیکن اس وقت جب ہم خود (اپنی غلطیوں اور نااہلیوں کی وجہ سے) دوسروں کی مدد کے محتاج ہو رہے ہیں، ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔

یہ ہیں وہ حقائق جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ہمیں ان کا سامنا کرنا چاہیئے اور یونہی جذبات کی رو میں بہہ نہیں چلے جانا چاہیئے۔ اس وقت ہمیں بھارت سے واشگاف الفاظ میں کہہ دینا چاہیئے کہ اس نے جو کچھ جونا گڑھ، حیدر آباد، کشمیر اور اب مشرقی پاکستان کے سلسلہ میں کیا ہے، ہم اسے صریحاً ظلم اور دھاندلی سمجھتے ہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسے اپنا فریضہ قرار دیتے ہیں کہ ان مظلومین کی مدد کی جائے۔ بھارت کے خلاف ہمارے جارحانہ عزائم نہ پہلے تھے نہ اب ہیں لیکن اس نے جو کچھ ناجائز کیا ہے اسے ہم کبھی جائز تسلیم نہیں کریں گے۔

(۸)

ہم سمجھتے ہیں کہ مذاکرات کے سلسلہ میں یہاں جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ مطالبات کے متعلق قوم سے استفسار و استصواب کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب پر روشن تھے۔ صدر بھٹو کو قوم سے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ میں آپ کے ان مطالبات کو بھارت کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا جو جواب ہوگا ان سے آپ کو مطلع کروں گا۔ ظاہر ہے کہ بھارت ان مطالبات کو بلا مشروط تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اس کے بعد قوم سے یہ کہنا چاہیئے کہ بھارت یہ شرائط پیش کرتا ہے کہ ہو کہ انہیں منظور کر لیا جائے یا نہ۔

اور اس کے بعد قوم کے لئے قولِ فیصل کا وقت آجاتا یعنی اس بات کے فیصلہ کا کہ اگر ہم بھارت کی شرائط نہ مانیں تو پھر کیا کریں! ظاہر ہے کہ اس بنیادی سوال کا جواب ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہم طاقت کے ذریعے بھارت کو حق و انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور کریں۔ تو یہاں یہ سوال سامنے آئے گا کہ کیا ہم میں اتنی طاقت ہے کہ ہم ایسا کر سکیں! یہ ہے نچوڑ اس ساری بحث کا۔ اگر ہم میں اتنی طاقت ہے تو پھر بحث و تمحیص بھی مفید ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو

پھر یہ تمام کوششیں عمل رہی ہیں۔ اس دور میں جب دین سیاست سے الگ ہو چکا ہے، طاقت کے بغیر کسی سے انصاف کی توقع رکھنا ابلہی ہے۔ اگر ہم میں انڈیا سے نمٹنے کی طاقت نہیں تو سر دست مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ایسی راہ اختیار کریں جس میں ہمیں کم از کم نقصان اٹھانا پڑے اور اس کے بعد اپنے اندر طاقت پیدا کرنے کے لئے ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ ہمیں اس وقت صلح حدیبیہ سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے۔ اُس وقت حضورؐ نے اندازہ فرما لیا تھا کہ ہم میں ہنوز اتنی طاقت نہیں جس سے قریشِ مکہ کے ظلم و استبداد کا سدِباب کیا جا سکے۔ اس لئے حضورؐ نے اپنے مطالبات پر جو یکسر حق پر مبنی تھے، زور نہ دیا۔ اور اس کے بعد اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لی کہ دو ہی برس کے بعد وہی قریش آپ کے حضور پا بجولاں کھڑے تھے۔ ملکوں میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ یہ تو زندگی کی گردشِ دولابی ہے۔ اس میں اگر کبھی سرنگوں ہونا پڑے تو اس سے بددل اور شکستہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے۔ کم از کم نقصان اٹھا کر اپنی کمی کے پورا کرنے کی مہلت حاصل کرنی چاہیئے۔ طاقت حاصل ہو جانے پر تمام نقصانات کی تلافی ہو جائے گی۔

باشۂ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اس مقام پر ہم اس حقیقت کو پھر دہرا دیں جسے ہم نے بیس برس پہلے پیش کیا تھا۔ اور وہ یہ کہ جب تک ہندو کو استخواں شکن شکست نہیں دی جائے گی، وہ نہ خود چین سے بیٹھے گا نہ ہمیں آرام سے بیٹھنے دے گا۔ ہندو کا واحد علاج قوت ہے۔ تقسیم سے پہلے یہاں کے ہندوؤں کے ہاں ایک کہاوت تھی کہ

مُسلے نوں ڈرائیے۔ ڈر جائے تے ڈرا جائیے نئیں تے آپ ڈر جائیے۔

یعنی مسلمان کو دھمکی دو۔ اگر وہ دھمکی میں آ جائے تو ھوالمراد۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس کے سامنے دب جائیے۔ بس یہ ہے ہندو کا علاج۔ اور اس کے لئے تو ہمیں اپنے گھر کی خبر لینی پڑے گی۔

---(۰)---

ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں ایسی قوتیں سرگرم عمل ہیں جو صدر بھٹو کو گرانا چاہتی ہیں۔ ان کا پروگرام یہ نظر آتا ہے کہ عوام میں ان جذبات کو زیادہ سے زیادہ حد تک مشتعل کر دیا جائے کہ "بنگلہ دیش" کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ جنگی قیدیوں کو واپس لایا جائے گا۔" بھارت کی روش سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں بلا شرط ممکن نہیں ہوں گی۔ اگر جنگی قیدیوں کو واپس لانا ہے تو "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو جنگی قیدی واپس نہیں آئیں گے۔ یہ قوتیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے عوام کے جذبات کو مشتعل کئے چلی جائیں گی اور جب صدر بھٹو ان کی منشاء کے مطابق مقصد حاصل کئے بغیر واپس آئیں گا تو یہ عوام کو اس کے خلاف اٹھا کھڑا کریں گے۔

ہم موجودہ حکومت سے قطعاً مطمئن نہیں۔ نہ ہی ہمارے پاس مسٹر بھٹو کا کوئی وکالت نامہ ہے لیکن جو تھوڑی بہت بصیرت ہمیں حاصل ہے اس کی روشنی میں ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس وقت صدر بھٹو کو گرا دیا گیا تو پھر پاکستان باقی نہیں رہ سکے گا۔ ہم اس خدشہ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے لیکن قرائن اس کی شہادت دیتے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک راہ صواب یہی ہے کہ صدر بھٹو اپنے مذاکرات کی پہلی نشست میں وہاں کسی قسم کی (COMMITMENT) نہ کریں بلکہ جو شرائط بھارت پیش کرے، انہیں یہ کہہ کر ساتھ لے آئیں کہ میں اپنی قوم سے استصواب کے بعد ان کے متعلق جواب دوں گا۔ اور پھر قوم کو بتایا

جائے کہ ہندوستان کیا چاہتا ہے اور ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ اس سے یہ اندرونی خطرہ ٹل جائے گا۔

صدر بھٹو نے اپنے حالیہ دورہ سے واپسی پر جو بیان جاری کیا تھا اس میں انہوں نے ان عناصر کی نشاندہی کی تھی جو ان کے مجوزہ مذاکرات دہلی کو ناکام بنانے کی سعی مذموم میں مصروف ہیں۔ اس سلسلہ میں موقر جریدہ نوائے وقت نے اپنی ۱۲ جون کی اشاعت میں ایک اداریہ سپردِ قلم کیا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

صدر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے تیرہ روزہ غیر ملکی دورے سے واپس آنے کے بعد ایک بیان جاری کیا ہے جس میں انہوں نے پاکستان کے "ازلی" دشمنوں کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے کراچی میں مزدوروں کے ہنگاموں اور لسانی مسئلہ پر متشددانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ تمام ہنگامے اچانک قسم کے حادثات نہیں بلکہ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبہ پر اشتراکِ عمل کا شاخسانہ ہے جس کا مقصد مذاکرات دہلی کی فضا پر اثر ڈالنا ہے۔ یہ عناصر روزِ اوّل سے پاکستان کے دشمن ہیں۔ بیشک وہ ماضی میں اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن اب انہیں سر اٹھانے اور ملک کو نیست و نابود کر دینے کا موقعہ نہیں دیا جائے گا۔

یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ صدر مملکت نے بالآخر پاکستان دشمن عناصر کی نشاندہی کر دی ہے اور یہ انتباہ بھی کر دیا ہے کہ انہیں سر اٹھانے کا موقعہ نہیں دیا جائے گا۔ یہ پاکستان دشمن عناصر قومی حلقوں کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں رہے۔ یہ عناصر وہی ہیں جنہوں نے برصغیر کی تقسیم کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ اور وہ پہلے دن سے ہی اس تقسیم ۔۔ پاکستان کی تشکیل ۔۔ کو غلط ثابت کرنے اور اسے مٹانے کی ناپاک مساعی میں مصروف ہیں۔ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے وہ کبھی علاقائی وحدتوں، علاقائی ثقافتوں، صوبائیت، علاقائی زبانوں کے فتنوں کو ہوا دے کر قومی اتحاد و یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی سوشلزم "انقلاب"، "سرخ سویرا" "ترقی پسندی" وغیرہ کے نعرے لگا کر پاکستان کے بنیادی نظریہ ۔۔ اسلام ۔۔ کو نقصان پہنچانے کی سعی کرتے ہیں۔

نوائے وقت نے بالکل درست لکھا ہے کہ "یہ عناصر وہی ہیں جنہوں نے برصغیر کی تقسیم کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا" لیکن اس کے بعد جب اس نے ان کی تفصیلی نشاندہی کی ہے تو اس میں مکمل فہرست سامنے نہیں لائی گئی۔ اس فہرست میں جماعتِ اسلامی، احرار، سرخپوش وغیرہ عناصر کا نام بھی آنا چاہیئے تھا۔ جماعتِ اسلامی کی پاکستان دشمنی کے متعلق خود نوائے وقت کے اس زمانے کے پرچے شاہد ہیں۔ خان عبدالغفار خان نے آج تک پاکستان کو بدل قبول نہیں کیا۔ مجلسِ احرار اور دیوبند نواز نیشنلسٹ علماء اپنی مخالفت کا چرچا اب تک بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ ابھی کل ہی مولانا غلام غوث ہزاروی نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے۔

میں آج محترمہ اندرا گاندھی کو خطاب کرنا چاہتا ہوں۔ میں تحریکِ آزادیٔ وطن میں ابتدا سے شریک رہا ہوں اور جب آپ کے والد پنڈت جواہر لال نہرو قصبہ وفاضلع ہزارہ میں آئے تھے اور انہیں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا وہ میں نے لکھا تھا۔ انہوں نے اسے سنبھال کر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ ہماری جماعت نے جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے ملکی تقسیم کو ملک و قوم اور اسلامی مفادات کے مطابق نہیں سمجھا تھا اور اس لئے ہم نے تقسیم کی مخالفت کی تھی مگر آپ کے بڑوں نے ملکی تقسیم کا فیصلہ کرتے وقت ہم لوگوں کو بالکل نظر انداز کر کے ہمیں مشکلات میں ڈال دیا۔

جو کسی وفادار ساتھی کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ (روزنامہ جنگ۔ کراچی ۱۴ جون ۱۹۷۲ء)

لہٰذا "روسی انقلابیوں" کے علاوہ مذکورہ بالا جماعتیں بھی وہ ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ اور پاکستان کو اب تک بدل قبول نہیں کیا۔ یہ سب ان مذموم کوششوں میں مصروف ہیں کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کے وجود کو ختم کر دیا جائے۔ اب ان کا جدید حربہ وہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ ہم صدر بھٹو سے بزور درخواست کریں گے کہ وہ جہاں بھارتی ماہرینِ سیاست کی مہرہ بازیوں پر کڑی نگاہ رکھیں وہاں اپنے ہاں کی ان پاکستان دشمن جماعتوں کی طرف سے بھی بغایت ہوشیار رہیں کہ پاکستان کی تخریب کے سلسلہ میں ان سب کا مقصود و مطلوب ایک ہے ---- خدا حافظ ---- بسلامت روی و باز آئی۔ (تحریر مؤرخہ ۱۷/۶/۷۲)

---- (-) ----

[ایک ماہ نامہ کی دشواری یہ ہے کہ اسے تاریخ اشاعت سے بہت پہلے مرتب کرنا پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس وقت پرچہ قارئین کے ہاتھوں تک پہنچتا ہے بہت سے حالات بدل چکے ہوتے ہیں۔ ہم آج ۱۷ جون کو یہ سطور قلمبند کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ جب یہ پرچہ یکم جولائی کو قارئین کے سامنے جائیگا کون کون سے نئے واقعات ظہور پذیر ہو چکے ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی بحث کو زیادہ تر اصولوں تک محدود رکھتے ہیں۔ والسلام]

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور ہر اتوار - صبح ۸ بجے

بمقام - ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ - لاہور

کراچی ہر اتوار - صبح ۹½ بجے

(بذریعہ ٹیپ)

بمقام - دفتر بزم طلوعِ اسلام

۱۳/۱ فردوس مارکیٹ

(بالمقابل بس سٹاپ) پہلی چورنگی۔ ناظم آباد۔ کراچی

اسلامی سوشلزم

مارکسزم کا فلسفہ۔ سوشلزم کی حقیقت۔ کمیونزم کا ناقابلِ عمل معاشی نظام۔ سوشلزم کا ابہام۔ قرآن کا معاشی نظام ----

اس خطاب نے ملک میں تہلکہ مچا دیا ہے

صدر بھٹو کے حالیہ وضاحتی بیان کو اس خطاب کی روشنی میں پڑھنے سے بات سمجھ میں آجاتی ہے!

طلوعِ اسلام سائز۔ سفید کاغذ ضخامت ۸۰ صفحات

قیمت :- ایک روپیہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

حقائق و عبر

۱۔ صحافتی لائسنس

ذرا غور کیجئے کہ ہمارے اخبارات میں کیا ہوتا ہے؟ آج سنسنی خیز سرخیوں کے ساتھ کسی لیڈر کا انٹرویو شائع ہوتا ہے جس میں کسی سنسنی خیز "راز" کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس سے فضا میں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے۔ قوم محوِ حیرت ہو جاتی ہے۔ دوسری صبح اسی اخبار میں اسی لیڈر کا بیان چھپتا ہے کہ میں نے کوئی انٹرویو ہی نہیں دیا۔ جو کچھ میری طرف منسوب کیا گیا ہے سب غلط ہے۔ اس پر نہ اس اخبار کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ ثابت کرے کہ جو کچھ اس نے شائع کیا تھا صحیح تھا۔ نہ ہی اس کی حاجت کہ اس پر اظہارِ ندامت کرے کہ اس میں غلطی سے اس لیڈر کی طرف منسوب کردہ انٹرویو شائع ہو گیا۔ نہ اس اخبار میں اس قسم کی کوئی بات چھپتی ہے۔ نہ وہ لیڈر ہی اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی کرتا ہے۔ باقی رہے اس اخبار کے قارئین، وہ دونوں خبریں اس طرح پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں گویا ان کا ان سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں۔

پچھلے دنوں پاکستان ٹائمز میں یہ تحیر انگیز خبر شائع ہوئی کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں، واہ فیکٹری نے ناقص قسم کا گولہ بارود سپلائی کیا تھا جس کی وجہ سے ہماری فوجیں ناکام رہ گئیں۔ ابھی اس خبر کی سیاہی خشک نہیں ہونے پائی تھی کہ اسی اخبار میں، ایک فوجی ترجمان کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی کہ وہ پہلی خبر بالکل بے بنیاد اور گمراہ کن تھی۔ (پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۹ جون) اس اخبار نے یہ تردید چھاپتے وقت ایک لفظ معذرت یا ندامت کا نہیں لکھا۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ خود حکومت نے اس قسم کی سنگین گمراہ کن خبر کی اشاعت پر متعلقہ گوشوں کے خلاف کوئی ایکشن لیا ہو — اسے کہتے ہیں صحافتی آزادی!

——— (۰) ———

۲۔ یہ پاکستان ہے

ایک خبر:- دریائے سندھ کا فالتو پانی سمندر میں بہا یا جاتا ہے، پنجاب کو نہیں دیا جاتا۔

دوسری خبر:- دریائے سندھ کے پانی سے پنجاب اپنے حصے کا ایک قطرہ بھی دوسرے صوبے کو نہیں دیگا۔ (گورنر پنجاب) (نوائے وقت ۹ جون)

تیسری خبر:- سندھ کے وزیرِ صنعت مسٹر قاسم حاجی عباس پٹیل نے اپنے محکمے کے افسروں اور عملہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس بات کی نگرانی کریں کہ سندھ کے کسی صنعتی یونٹ کی مشینیں ہٹا کر دوسری جگہ نہ لے جائی جائیں۔ یہ حکم انہوں نے اس اطلاع کے بعد دیا ہے کہ بعض صنعت کار اپنے صنعتی یونٹس یہاں سے ہٹا کر دوسرے صوبوں میں لے جا رہے ہیں۔ (جنگ کراچی ۲۶ جون)

چوتھی خبر:- سندھ کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر ممتاز بھٹو نے ٹنڈو آدم میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہو فرمایا کہ "سندھ کا نمک کھانے والوں کو نمک حلالی کرنے چاہیئے"۔ (جنگ کراچی - ۷ جون)

یاد رکھیئے جس طرح مذہبی فرقوں، نسلی امتیازات اور سیاسی پارٹیوں کی موجودگی میں اسلام باقی نہیں رہتا، اسی طرح

صوبوں کی موجودگی میں، پاکستان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ حقیقت کسی کے جھٹلائے جھوٹی ثابت نہیں ہو سکتی۔

(۰)

۳۔ غداروں کے بیج

کراچی کے روزنامہ جنگ کی ۸ جون کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ تحریکِ استقلال کے جنرل سیکرٹری ملک غلام جیلانی نے کہا ہے: بنگلہ دیش کے جھنڈے کراچی کے ایک بنگلہ میں تیار ہوئے تھے۔ وہاں سے یحییٰ خان کے بھائی آغا محمد علی کی زیرِ نگرانی ڈھاکہ پہنچائے گئے اور وہاں شیخ الرحمٰن کے ساتھ عطاء الرحمٰن کی ساعی سے پورے ڈھاکہ میں تقسیم کئے گئے۔

غداروں کے بیج کس نے بوئے اور فصل کس نے کاٹی۔!

(۰)

۴۔ یہ جمہوریت ہے

کراچی ۱۴ مئی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان نے کہا ہے کہ میں صدر بھٹو کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اکثریت میں ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ اس لئے غلط ہے کہ ان کی پارٹی کو پاکستان کے چار صوبوں میں سے صرف دو صوبوں میں اکثریت حاصل ہے۔

اصولِ جمہوریت کی رو سے مرکز میں حکومت اس پارٹی کی ہوتی ہے جسے مرکزی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو لیکن خان صاحب کے تصورِ جمہوریت کی رو سے، اکثریت کا دعویٰ اسے کرنا چاہیئے جسے چاروں صوبوں میں اکثریت حاصل ہو۔ اس وقت اس قسم کی اکثریت کسی پارٹی کو بھی حاصل نہیں اس لئے پاکستان کی مرکزی حکومت قائم ہو نہیں سکتی۔ اس ملک کا کاروبار بلا مرکزی حکومت چلنا چاہیئے۔!

اسے کہتے ہیں "سیاہ چشمہ والی" سیاست!

(۰)

۵۔ کراچی سے ایک صاحب رقمطراز ہیں کہ کراچی کے در و دیوار پر ایک پوسٹر چسپاں ہے جس میں مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے "مسلمان کی تعریف" ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

مسلمان وہ شخص ہے جو ضروریاتِ دین اور کتاب و سنت پر یقین رکھتا ہو اور حضور نبی اکرمؐ کو آخری نبی مانتا ہو۔ اور قرآن و سنت کی تعبیر جو سلف صالحین سے اجمالاً منقول ہے صحیح جانتا ہو۔

کیا فرماتے ہیں حنفیوں کے علاوہ باقی فرقوں کے مفتیانِ شرعِ مبین اور حاملانِ دینِ متین بیچ اس "تعریف" کے؟

کس قدر قابلِ رحم ہے حالت ان بیچاروں کی۔ دعا کیجیئے کہ اللہ کسی کو اس طرح تنگ نہ کرے۔!!

(۰)

۶۔ بوجھو تو جانیں!

"کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک اسلامی کہلا سکے۔"

"ملک کے مستقل دستور میں یہ شق لازماً رکھی جائے کہ پاکستان میں تمام قوانین کتاب و سنت کے مطابق بنائے جا سکیں۔"

کیا آپ بتا سکیں گے کہ یہ کون بزرگوار ہیں جو ایک ہی سانس میں اس قسم کی متضاد باتیں کہہ سکتے ہیں؟

(۰)

پاکستان کے متعلق

خدائی فیصلہ

پرویز صاحب کا خطاب جسے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اپریل ۱۹۷۲ء میں پیش فرمایا۔

اس کی پہلی قسط طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ دوسری اور آخری قسط اب پیش خدمت ہے۔

(۲)

قومِ مدین

حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ اس کی نسل تاریخ کے صفحات پر قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ یہ قوم حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقے میں سکونت پذیر تھی۔ حضرت شعیبؑ اس قوم کیطرف مبعوث ہوئے تھے جن کا زمانہ قریباً ۱۶۰۰ (ق۔م) قیاس کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تصریحات کے مطابق یہ قوم تجارت پیشہ تھی اور اس شعبہ میں انہوں نے بڑی ترقی حاصل کر رکھی تھی۔

سرمایہ پرستوں کا نظامِ تجارت

لیکن ہر تجارت پیشہ سرمایہ پرست قوم کی طرح ان کا انداز بھی یہ تھا کہ وہ "لیتے زیادہ تھے اور دیتے کم تھے"۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک طرف محنت کش کے خون کا آخری قطرہ تک بھی نچوڑ لیں اور دوسری طرف ہر حیلہ کاری اور فریب دہی سے گاہک کی جیب بھی کاٹ لی جائے۔ قومِ ثمود میں اگر نظامِ سرمایہ داری کا عفریت زمینداری کی شکل میں لکد کوب تھا تو قومِ مدین میں وہ سوداگری کے پیرہن میں پائے زن۔ یہ تھی وہ قوم جس کی طرف آسمانی انقلاب کے پیامبر حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ قرآن کریم نے ان کے تذکرہ جلیلہ کا آغاز ایک عمیق بصیرت افروز نکتہ سے کیا ہے حضرت شعیبؑ نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کی قوم نے سمجھا کہ یہ خدا پرست انسان لوگوں کو ایشور کی بھگتی اور پوجا پاٹ کی تلقین کرتا ہے سو یہ بات قابلِ اعتراض نہیں اس لئے اسے اس کی اجازت دے دینی چاہیئے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص ان کے کاروباری معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگ گیا ہے۔ کبھی ان سے کہتا ہے کہ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ۔ دیکھو اپنے ماپ اور تول کے پیمانے کم نہ رکھو۔ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ۔ ٹھیک ٹھیک ماپو۔ صحیح صحیح تولو۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ۔ (۲۶/۱۸۳) گاہک کو اس کی ادا کردہ قیمت

کے مطابق چیز دو۔ نہ اس میں کمی کرو نہ ملاوٹ۔ اور کبھی ان سے کہتا ہے کہ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ۔ ایسا نہ کرو کہ مختلف شاہراہوں پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔ بارڈروں پر جا کر سمگلنگ کرو۔ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا۔ (۷/۸۶) اور جو دیانتدار انسان تمہیں اس روش سے روکے، اسے ڈرانے دھمکانے لگ جاؤ۔ اور اس طرح معاشرے میں ناہمواریاں اور پیچیدگیاں پیدا کرتے چلے جاؤ۔ اس پر وہ لوگ بڑے متعجب ہوئے اور حضرت شعیبؑ سے کہنے لگے کہ تم نے ہم سے صلوٰۃ کی اجازت مانگی تھی اور ہم نے اس کی یہ سمجھ کر اجازت دے دی تھی کہ تم اگر اپنے طریق پر خدا کی پرستش کر لیا کرو تو اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ ...... اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ (۱۱/۸۷) تمہاری یہ صلوٰۃ

یہ صلوٰۃ کیسی ہے؟

کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف میں لا سکیں۔ نماز کو معاشی نظام سے کیا واسطہ! نماز کا تعلق مذہب سے ہے، معاشیات کا تعلق امورِ دنیا سے۔ یہ تمہارا مذہب کس قسم کا ہے جس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہے۔

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ سیکولر نظامِ زندگی کا تصور کچھ عصرِ حاضر کی ایجاد نہیں۔ دین اور مذہب کا یہ فرق شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اربابِ سیاست و معاشیات کو اس سے کچھ تعرض نہیں ہوتا کہ لوگ مذہبی عقاید کس قسم کے رکھتے ہیں، اور پرستش اور پوجا پاٹ کس طور طریق سے کرتے ہیں۔ یہ مذہب کی دنیا ہے جس کی وہ پوری پوری آزادی دے دیتے ہیں۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ مذہب، دنیاوی معاملات میں بھی دخل اندازی کرے۔ (اسے دین کہتے ہیں) قوم شعیبؑ کا تصورِ زندگی بھی سیکولر انداز کا تھا۔ اسی لئے وہ حضرت شعیبؑ کی اس دعوت پر متعجب اور معترض تھے جس کی بنیاد دین پر تھی۔

اس مقام پر ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے۔ حضرات انبیاء کرام عام طور پر ممتاز گھرانوں کے افراد ہوتے تھے۔ اس لئے جب وہ اس روش کی مخالفت کرتے تھے جو خود ان کے اپنے گھرانے اور اسی جیسے دوسرے گھرانوں میں متوارث چلی آتی تھی، تو غیر تو ایک طرف، خود اپنوں کو بھی ان پر تعجب ہوتا تھا کہ یہ عجیب پاگل ہے جو اپنے گھر کی دولت وحشمت اور شرف وعزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ رہا ہے۔ حضرت شعیبؑ بھی ایک ذی اثر گھرانے کے فرد تھے۔ اسی لئے قوم کے اکابرین نے ان سے کہا کہ لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ۔ (۱۱/۹۱) اگر ہمیں تمہارے خاندان اور برادری کا پاس نہ ہوتا، تو ہم تمہیں کبھی کا سنگسار کر چکے ہوتے۔ اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا کہ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ (۱۱/۹۲) تم عجیب لوگ ہو جنہیں خدا کے قانونِ مکافات کا تو کچھ ڈر نہیں۔ لیکن میری برادری کا پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

اِدھر سے ہٹ کر انہوں نے اُن لوگوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا جنہوں نے حضرت شعیبؑ کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ یہ غریب لوگ تھے اور ان کی برادریاں بھی طاقتور اور ذی اثر نہیں تھیں۔ انہی اَلْمَلَاُ الْقَوْمِ نے ان سے کہا کہ تم اس انقلابی شخص کا ساتھ چھوڑ دو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے (۷/۹۰) لیکن انہوں نے بھی ان کی ایک نہ مانی۔

بہرحال انہوں نے اپنے نظام کو نہ بدلا تا آنکہ وہ (قرآن کے الفاظ میں) اس طرح ان کے اوپر آ کر گرا کہ وہ اس کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے اور ان کے گھر اس طرح اُجڑ گئے كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا۔ (۱۱/۹۵) گویا وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

یہ تھا انجام اس نظامِ معیشت کا جس میں تجارت، خون آشامی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تجارت کا تعلق شہری معیشت سے

ہوتا ہے۔ جہاں تک ان کی دیہاتی زندگی کا متعلق ہے، وہاں وہی زمینداری نظام رائج تھا جسے ہم قومِ ثمود کے ہاں دیکھ آئے ہیں۔ اس کی ایک جھلک ہمارے سامنے نقشہ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ میں آتی ہے۔

مدین کا پیاؤ

جب حضرت موسیٰؑ (زمانہ قبل از نبوت میں) فرعون کے پنجۂ استبداد سے بچنے کی خاطر مصر سے بھاگے ہیں تو مدین کے علاقہ میں (مصر راستے) ایک پیاؤ کے قریب اکر، درختوں کے سایہ میں سستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ وہ دیکھتے کیا ہیں کہ سامنے پیاؤ پر اوروں کے مویشی پانی پی پی کر چلے جا رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جن کی بھیڑیں پیاس کی شدت سے پیاؤ کی طرف دوڑ دوڑ کر جانا چاہتی ہیں، لیکن وہ لڑکیاں انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ سے نہ رہا گیا اور ان لڑکیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ تم اپنی پیاسی بھیڑوں کو اس طرح روک کیوں رہی ہو؟ انہوں نے کہا کہ ان مویشیوں کے چرواہے زور آور ہیں اور ہماری حالت یہ کہ گھر میں کوئی مرد نہیں بجز ایک باپ کے، جو بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس لئے جب تک یہ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر، چلے نہیں جاتے، ہم اپنی بھیڑوں کو کیسے آگے بڑھنے دے سکتی ہیں۔ یہ سنکر حضرت موسیٰؑ نے ایک سرد آہ بھری اور کہا کہ — ہر زمینے کہ بینم آسماں پیداست — ارضِ فرعون سے بھاگا تھا کہ وہاں کمزوروں اور غریبوں پر طرح طرح کے مظالم ہوتے ہیں۔ یہاں آیا ہوں تو یہاں بھی کمزوروں اور بے کسوں کی وہی حالت ہے۔ یہ کہہ کر اٹھے۔ آگے بڑھ کر ان کی بھیڑوں کو پانی پلایا اور پھر درختوں کے نیچے آکر بیٹھ گئے اور خدا سے آکر کہنے لگے کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

یہ تھی قومِ مدین کی دیہاتی زندگی، اور وہ تھی ان کی شہری زندگی۔ ظاہر ہے کہ وہ تباہ نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔

قومِ لوط

اس وقت تک جن اقوام کی سرگزشت ہمارے سامنے آئی ہے وہ اپنے غلط سیاسی یا معاشی نظام کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اب ہمارے سامنے ایک ایسی قوم آتی ہے جس کا جرم خود اس کے نام کے اندر مضمر ہے۔ یہ ہے قومِ لوط، جس کی نسبت سے لواطت کی نہایت مکروہ اصطلاح وجود میں آئی۔ ان کے مرکزی مقام کا نام سدوم تھا جسے انگریزی میں (SODOM) لکھتے ہیں۔ (SODOMY) کے لفظ کی نسبت اسی کی طرف ہے۔

قرآن کریم عصمت کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کا شمار مستقل اقدار میں کرتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ عصمت خاصۂ انسانیت ہے۔ حیوانوں میں اس کا تصور نہیں ہوتا۔ لہٰذا جسے عصمت کا احساس نہ ہے وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اور جب جنسی جذبہ کی تسکین بدنہادی (PERVERSION) تک پہنچ جائے تو وہ مقام بَلْ هُمْ اَضَلُّ کا ہو جاتا ہے۔ یعنی حیوانوں سے بھی زیادہ پست سطح۔ کیونکہ حیوانوں میں (SEX-PERVERSION) نہیں ہوتی۔ یہ جرم انفرادی طور پر بھی کچھ کم شرمناک نہیں ہوتا۔ لیکن جب یہ کسی معاشرہ کا عام معمول بن جائے تو اسے انسانی معاشرہ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک جب قومِ لوط کی سرگزشت ہمارے سامنے آتی تھی تو ہم حیران رہ جاتے تھے کہ وہ قوم، پوری کی پوری، اس قسم کی شنیع حرکت کی مرتکب کیسے ہو گئی۔ لیکن اب یہ بات چنداں وجہ حیرت نہیں رہی۔ قومِ لوط کی

سرگزشت تو آج سے چار ہزار سال پہلے کے دورِ جہالت سے متعلق ہے۔ آج اس بیسویں صدی کے زمانۂ علم و بصیرت میں

دورِ حاضرہ کی حالت

دنیا کی سب سے بڑی مہذب اور متمدن قوم' برطانیہ نے حال ہی میں وہ قانون پاس کیا ہے جس کی رُو سے لواطت (HOMO - SEXUALITY) کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۔ (۹۵/۴) ہم نے تو انسان کو حسین ترین ہیئت میں پیدا کیا تھا۔ لیکن یہ کمبخت' اپنی حرکات سے اپنے آپ کو پست سے پست سطح پر لے جاتا ہے۔

اُس قوم کی بے حیائی اور سرکشی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت لوطؑ نے انہیں اس انسانیت سوز فعل سے باز رہنے کی تلقین کی تو بجائے اس کے کہ انہیں اس پر کچھ ندامت ہوتی' وہ آپس میں کہنے لگے کہ أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ۔ (۷/۸۲) "یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا مقدس اور پاکباز سمجھتے ہیں۔ انہیں بستی سے نکال باہر کرو" اس پوری قوم کی طرف سے اس قسم کی باتیں سن کر حضرت لوطؑ محوِ حیرت ہو جاتے تھے اور انتہائی تعجب اور تأسف سے کہتے تھے کہ أَلَيْسَ مِنكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ ۔ (۱۱/۷۸) کیا تم میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو ذرا سوجھ بوجھ سے کام لے! لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ وبا اس قدر عام ہو چکی تھی کہ اس کے ہلاکت آفریں جراثیم سے قوم کا ایک متنفس بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں جرائم اس درجہ عام ہو جائیں تو اس کی تباہی میں کونسی کسر باقی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ وہ قوم تباہ ہو گئی اور اس طرح تباہ ہوئی کہ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ۔ (۱۱/۸۲) اس کی بلندیاں پستیوں میں بدل گئیں۔ چنانچہ بحرِ میت (DEAD - SEA) کا مہیب اور لرزہ انگیز ماحول اور اس میں بکھرے ہوئے کھنڈرات کی ویرانیاں' آج بھی اس سوختہ بخت قوم کے عبرت انگیز انجام کے مرثیہ خواں ہیں۔

اقوامِ مغرب کی عریاں اور آبرو باختہ تہذیب سے متاثر ذہنیتوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا قوموں کی موت و حیات سے کیا واسطہ! ان لوگوں کو وحی کی سند سے کچھ سمجھانا بیکار ہے۔ وہ اسے سند مانتے ہی نہیں۔ لیکن مغربی محققین کو تو یہ سند تسلیم کرتے ہیں۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ ان محققین سے پوچھ لیں کہ ان کی تحقیق اس باب میں کیا کہتی ہے۔ زیادہ نہیں تو وہ کیمبرج یونیورسٹی کے ریسرچ سکالر ڈاکٹر (J.D. UNWIN) کی کتاب (SEX & CULTURE) اٹھا کر دیکھ لیں جسے اس نے اسی غیر مہذب قدیم قبائل' اور سو مہذب اقوام کی جنسی زندگی کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (ص۲۰۳)

اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں (ص۳۳)

لہٰذا جنسی ضوابط سے بیباک ہو جانے والا معاشرہ اگر سمجھتا ہے کہ اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا تو اسے اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ اس کا آخری نتیجہ قومی تباہی کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔

قومِ فرعون

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جس کے جرائم کی فہرست طول طویل ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے انہیں تین اصولی اور اساسی شقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی استبداد ملوکیت کی تہر سامانیاں جن کا مجسمہ فرعون تھا۔ مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریاں جن کا پیکر ہامان تھا۔ اور نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامیاں جن کا نمائندہ قارون تھا۔ یہ تینوں یکجا' اور ان کے آہنی پنجے میں گرفتار' قومِ بنی اسرائیل کی شکل میں تڑپتی' پھڑکتی انسانیت۔ دوسری طرف قرآنِ کریم نے ان تینوں گوشوں کے جرائم کا تذکرہ اس شرح و بسط سے کیا ہے کہ میری تصنیف' برقِ طور' کے قریب اڑھائی سو صفحات بمشکل انہیں اپنے دامن میں سمیٹ سکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر تفصیل کو اتنے مختصر وقت میں' سامنے لانا ناممکن ہے۔ اس لئے میں ان کے سرسری تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔

پارٹی بازی

جیسا کہ نظامِ ملوکیت کا خاصا ہے' فرعون نے قومِ بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا تھا اور انہیں طرح طرح کے عذاب دیتا تھا۔ وہ اس ڈر سے کہ بنی اسرائیل کہیں ایک مرکز پر جمع ہو کر اس کے لئے خطرہ کا موجب نہ بن جائے' کرتا یہ تھا کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ۔ (۲۸/۴) ان میں پارٹیاں بناتا رہتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو کمزور کرتا رہتا۔ پھر اس کی چال یہ تھی کہ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ (۲۸/۴) وہ اس قومِ محکوم کے جن افراد میں جوہرِ مردانگی کے آثار دیکھتا' انہیں کچل دیتا اور ان کے نامرد طبقے کو اپنا مقرب بناتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس نے رزق کے سب سرچشمے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے۔ اس لئے یہ مظلوم و محکوم قوم' نانِ شبینہ تک کے لئے اس کی محتاج تھی۔ اسی لئے اس نے جب ان میں ذرا سی سرکشی کے آثار دیکھے تو پوری گرج کے ساتھ کہا کہ اَلَيْسَ

ان داتا

لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (۴۳/۵۱) تم جانتے نہیں کہ یہ ملک میرا ہے۔ اس میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں ہیں۔ میں تمہیں بھوکا مار دوں گا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ (۷۹/۲۴) میں تمہارا پالنے والا ہوں۔ اس لئے مجھے حق حاصل ہے کہ تم پر حکومت کروں۔ جو جنہیں روٹی دیتا ہے وہی ان کا آقا اور خدا ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں برادرانِ عزیز! کہ اس ذہنیت سے کس طرح تمرد و نخوت کے شعلے ابھرتے اور سرکشی اور انانیت کے طوفان اٹھتے ہیں۔

یہ تھا وہ فرعون جس کی طرف حضرت موسیٰؑ کو یہ کہہ کر بھیجا گیا کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴) فرعون کی طرف جاؤ۔ اس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی ہے۔ اس کی سرکشی حدود فراموش ہو گئی ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ۔ (۲۳/۴۶) فرعون اور اس کے ارکانِ مملکت اور سردارانِ قوم کی طرف جو تکبر و نخوت کے پیکر تھے۔ قرآنِ کریم نے اس قوم کو کہیں مجرمین کہا ہے کہیں ظالمین۔ کہیں مفسدین کہا ہے کہیں فاسقین۔ یعنی ظلم و استبداد اور سرکشی و حدود فراموشی کے جس قدر جرائم ہو سکتے تھے وہ سب ان میں موجود تھے۔

حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف آئے اور اس سے کہا کہ میں خدائے رب العالمین کا پیغامبر ہوں اور تم سے صرف اتنا مطالبہ کرنے کے لئے آیا ہوں کہ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۱۷) بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ دوسرے مقام پر جو الفاظ آئے ہیں وہ اس پیغمبرانہ مشن کی اور بھی زیادہ وضاحت کرتے ہیں۔ آپ نے اس سے کہا کہ میں اس لئے آیا ہوں۔ اَنْ

اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ (۱۸) "کہ خدا کے بندوں کو میرے حوالے کر دے کہ میں انہیں خدا کی زمین میں لے جاؤں جہاں وہ خدا کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے یہاں عباد اللہ کہہ کر ساری بات واضح کر دی۔ یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنے فیصلوں کا محکوم بنائے۔ انسان صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اپنے جیسے انسانوں کا غلام بننے کے لئے نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ کا مطالبہ کس قدر صاف سیدھا اور مبنی برحق و انصاف تھا۔ انہوں نے نہ فرعون سے اس کی بادشاہت چھین لینے کا مطالبہ کیا تھا، نہ اس کی حکومت میں شریک ہونے کا دعویٰ۔ کہا صرف یہ تھا کہ اس مظلوم قوم کو اجازت دیدے کہ یہ کسی اور خطۂ زمین کی طرف چلی جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایک قوم غالب اپنے ہاں کی اقلیت کو وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دے تو وہ پھر حکومت کس پر کرے۔ (ضمناً یہ بعینہٖ وہی پوزیشن تھی جو تقسیم ہند سے پہلے ہمارے اور ہندوؤں میں بنائے نزاع تھی۔ ہندو بھی اسی لئے ہماری علیحدگی پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ اگر مسلمان وہاں سے چلے گئے تو وہ حکومت کس پر کریگا۔)

فرعون نے اس مطالبہ کی مخالفت کی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوزیشن وہاں بڑی مؤثر اور حضرت موسیٰؑ کا مقام خاصا بلند تھا۔ اسی لئے فرعون ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکا اور اس کی بجائے اس نے سیاستِ ملوکانہ سے کام نکالنا چاہا۔ اس نے پہلے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اپنے دیرینہ روابط کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہم نے تم پر اس قدر احسانات کئے اور تم اس کا بدلہ اس طرح دے رہے ہو! آپ کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کا کیا جواب دیا! آپ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ (۲۶/۲۲) تم مجھ پر جو ذاتی احسانات کے ان کی یاد تو دلاتے ہو لیکن اپنے اس سب سے بڑے "احسان" کی یاد کیوں نہیں دلاتے کہ تم نے پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے! تم مجھ سے سودا کرنا چاہتے ہو کہ مجھ پر ذاتی نوازشات کی قیمت میں بنی اسرائیل کی آزادی خرید لو۔

احسانات کی یاددہانی

برو ایں دام برمرغِ دگر نہ — کہ عنقا را بلند است آشیانہ

جب وہ اپنے اس حربے میں ناکام رہا تو اس نے پھر وہ تدبیر اختیار کی جو حکمتِ فرعونی کا آخری حربہ ہوتی ہے۔ یعنی اس نے جھوٹے پراپیگنڈہ سے عوام کو برانگیختہ کرنا چاہا کہ وہ بنی اسرائیل کے خلاف ہنگامہ آرائیاں شروع کر دیں۔ قرآن میں ہے قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ۔ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ۔ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ (۲۶/۳۴-۳۵)، فرعون نے اپنے ارکینِ مملکت سے کہا کہ یہ شخص بہت بڑا فریب کار نظر آتا ہے۔ مطالبہ تو بظاہر یہ کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے لے جائے، لیکن درحقیقت اس کا پلان یہ ہے کہ تمہیں اس مملکت سے نکال باہر کرے اور خود حکمران بن بیٹھے۔ کہو! اس فتنے کو فرو کرنے کے سلسلہ میں تمہارا کیا مشورہ ہے۔

اراکینِ مملکت نے کہا کہ اس کے خلاف اس قسم کا پراپیگنڈہ کارگر نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ اسے جذباتی مسئلہ بنا دیا جائے۔ اور اسے مذہبی پیشوائیت کے ساتھ جوڑ کر عوام کو اشتعال دلایا جائے کہ یہ شخص اپنا مذہب تم پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ فرعون اور اسکے ارکین کے بجائے، ہامان اور اس کے جنود (مذہبی لشکروں) کے ساتھ شروع ہوتا ہے جو (قرآن کے استعارے کے مطابق) رسیوں کے سانپ بنا بنا کر عوام کو فریب دیتے تھے۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ کیسا ہوتا ہے، اور ان خدائی فوجداروں کے پیشِ نظر مقاصد کیا ہوتے ہیں! اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہ آتے تو ہیں اپنے مذہب کی حقانیت اور فوقیت ثابت

مذہبی پیشوائیت

کرنے کے لئے۔ لیکن بادشاہ سے پہلے معاملہ طے کرتے ہیں کہ ہم اگر کامیاب ہو گئے تو ہمیں ملیگا کیا؟ اور بادشاہ انہیں یہ لالچ دیتا ہے کہ ان کا شمار بادشاہ کے مقربین میں ہو جائیگا۔ دوسری طرف ان لوگوں کی منافقت کا یہ عالم تھا کہ قرآن کے بیان کے مطابق، وہ دل سے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ موسیٰؑ کا دعویٰ حق و صداقت پر مبنی ہے لیکن ان کا پندارِ نفس انہیں اس حقیقت کے اعتراف کیطرف آنے نہیں دیتا تھا۔ (۲۷/۱۴)

لیکن ان میں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جنہوں نے اس اعتراف کی جرأت کر لی اور اعلان کر دیا کہ موسیٰ کا دعویٰ سچا ہے۔ اس پر جس طرح فرعون گرجا اور برسا ہے، قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے لیکن (بغرضِ اختصار) میں اس سلسلہ میں صرف ایک نکتہ کو سامنے لانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ فرعون نے ان سے کہا کہ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ۔ (۲۰/۷۱) تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اپنے عقیدہ میں تبدیلی کر لی۔ اب دیکھو میں تمہارے کس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمہیں صلیب پر لٹکاتا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ استبداد ملوکیت، آزادیٔ خیال و عقاید کی اجازت نہیں دیتا۔ اس میں تبدیلیٔ عقیدہ (ارتداد) کی سزا موت ہوتی ہے۔ یہ تھا ملوکیت کے استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا گٹھ جوڑ۔ باقی رہا قارونؔ، سو اس کے متعلق قرآن نے

قارون

کہا ہے کہ وہ خود قومِ موسیٰ میں سے تھا۔ یعنی بنی اسرائیل ایکطرف تو غیر قوم (قومِ فرعون) کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف خود اپنے ہاں کا سرمایہ دار طبقہ ان کا خون چوس رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس نظام میں دسیسہ کاری، ملوکیت، ابلہ فریبی، مذہبی پیشوائیت اور خون آشامی، سرمایہ پرستی اس حد تک پہنچی ہو، وہ نظام، اس قوم کو لیکر ڈوبے گا نہیں تو اور کیا ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامَانَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ۔ (۲۸/۶) فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں نے اپنی آنکھوں سے اپنا وہ انجام دیکھ لیا جس سے وہ اس قدر خائف تھے۔ اور بنی اسرائیل نے آزادی کی فضا میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

قومِ بنی اسرائیل

اور اب ہم اس قوم کی طرف آتے ہیں جسے فرعون کے مظالم سے رستگاری کے بعد، آزادی کی نعمت سے نوازا گیا تھا۔ قرآن کریم نے اس قوم کی داستان بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہے اور ان کے تمام جرائم کو ایک ایک کر کے گنایا ہے جن کے نتیجہ میں وہ، شوکت و حشمت کی اسقدر بلندیوں تک پہنچنے کے بعد، اس طرح ذلیل و خوار ہوئی کہ دنیا کی کسی قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن نے سب سے پہلے یہ کہا ہے کہ چونکہ اس قوم کو یہ مملکت، محض ان کے قائد (حضرت موسیٰؑ) کے دعوے کی صداقت اور بلندیٔ سیرت و کردار کی بنا پر، بیٹھے بٹھائے مل گئی تھی، اس لئے اسے اس کی قدر ہی نہیں تھی۔ وہ (تورات کے الفاظ میں) قدم قدم پر حضرت موسےٰ سے جھلا جھلا کر کہتے تھے کہ "تو ہمیں کہاں مرنے کے لئے لے آیا ہے۔ ہم مصر میں بہت اچھے تھے۔ مصریوں کی ہانڈیاں پکاتے تھے اور من بھر کر روٹی کھاتے تھے۔ ہم سے ہاتھ اٹھا کہ ہم پھر وہیں چلے جائیں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا، بیابان میں مرنے سے ہزار درجے بہتر ہو گا۔"

عزیزانِ من! ایک تو میں اپنے موضوع سے دور ہٹ جاؤں گا، اور دوسرے ہمارے پاس اتنا وقت بھی نہیں، ورنہ میں تفصیل سے بتاتا کہ بنی اسرائیل کی غلامی، غلامی کے بعد آزادی اور (اس طرح مفت میں ملی ہوئی آزادی) کے بعد ان کی ذہنی اور

نفسیاتی کیفیت' اور اس کے عبرت آموز مظاہرے' کس طرح ہماری آزادی اور آزادی کے بعد ہماری حالت کے ہو بہو عکس ہیں۔ اس داستان کو پڑھئے تو یوں نظر آتا ہے کہ مکان و زمان کی تبدیلی کے ساتھ وہ گویا خود ہماری کہانی ہے۔ بہرحال' جب حضرت موسیٰ' ان کی اس قسم کی حرکتوں سے تنگ آکر خدا سے

بنی اسرائیل اور ہم

فریاد کرتے کہ اس قسم کی قوم کا کیا کروں' تو انہیں جواب ملتا کہ یہ قوم غلامی کی فضا میں پرورش یافتہ ہے' اس لئے ان کی ذہنیت بدلتے ہی بدلے گی۔ تم ان کے بڑے بوڑھوں کو تو مرنے دو' لیکن ان کی آنے والی نسل کی پرورش اور تربیت اپنے زیر نگرانی کرو۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا' اور جب یہ نئی نسل پروان چڑھی تو اس نے مملکتِ خداداد کو مستحکم ہی نہیں بلکہ اسے سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی سے اس طرح ہمکنار کیا کہ ان کے عروج اور ترقی کی چمک دمک سے ایک عالم کی آنکھیں چندھیا گئیں لیکن اس کے بعد اس قوم میں جب وہ خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں جو دولت اور قوت کے غلط استعمال کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں' تو وہ اس طرح تباہ ہوئی کہ اس کی نظیر بھی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ان کی پہلی تباہی' بابل کے بادشاہ' بخت نصر کے ہاتھوں (تقریباً ۶۰۰ ق م میں) اس طرح ہوئی کہ اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور عام قتل و غارت گری کے بعد' جو یہودی باقی بچے' انہیں ڈھور ڈنگر کیطرح ہانک کر بابل لے گیا۔ جہاں وہ قریب ایک سو سال تک غلامی کی بدترین صعوبتوں کا شکار رہے۔ لیکن انہیں بازآفرینی کا ایک اور موقعہ دیا گیا اور ایران کے خداترس حکمران' سائرس (ذوالقرنین) نے' انہیں بابل کی غلامی سے رہائی دلا کر' دوبارہ یروشلم میں لا بسایا۔ اس کے بعد ان میں پھر وہی خرابیاں عود کر آئیں تو آخری حجت کے طور پر' ان کی طرف حضرت عیسیٰؑ جیسا عظیم پیغامبر مقدر مبعوث ہوا۔ لیکن انہوں نے جب ان کی دعوت کی مخالفت کی اور اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو ان کی آخری تباہی' رومیوں کے گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں (۷۰ء میں) اس طرح عمل میں آئی کہ وہ قریب دو ہزار سال تک' خانماں خراب' بے گھر بے در' زمانے کی ٹھوکریں کھاتے پھرے' تاآنکہ اب انہیں' مغربی طاقتوں کے تصدق' فلسطین میں رہنے کا ٹھکانہ ملا۔

خرابیوں کی فہرست

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' قرآن کریم نے ان کے جرائم کی فہرست بڑی تفصیل سے دی ہے لیکن میں (بغرض اختصار) ان میں سے صرف ان جرائم کو سامنے لانا چاہتا ہوں جو زیادہ نمایاں تھے مثلاً:

(۱) ان کے معاشرہ کی بنیاد سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر تھی۔ (۹/۳۴)

(۲) نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد' ربٰو پر ہوتی ہے۔ یعنی اس اصول پر کہ معاوضہ محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ربٰو کا چلن عام تھا۔ حالانکہ ان کے رسولوں نے انہیں اس سے سختی سے روکا تھا۔ (۴/۱۶۱)

(۳) ربٰو کے علاوہ' وہ دوسروں کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہتھیا لیتے اور ہضم کر جاتے تھے۔ (۴/۱۶۱) (۵/۶۴) اس سلسلہ میں ان کی ہوسِ زر پرستی کس حد تک پہنچ چکی تھی' قرآن کریم نے اسے اس مقدمہ کے ضمن میں بیان کیا ہے جو حضرت داؤدؑ کے سامنے پیش ہوا تھا۔ مدعی کی فریاد یہ تھی کہ مدعا علیہ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں اور ہے بھی یہ بھائی۔ اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ میرا بھائی مجھے کہتا ہے کہ تم یہ ایک بھیڑ بھی مجھے دیدو۔ تم نے اسے رکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی ذہنیت یا ان کا معاشی نظام۔

(۴) غریبوں اور محنت کشوں کی کاڑھے پسینے کی کمائی کے سلب و نہب سے' سرمایہ داروں کے دل میں اگر کبھی کوئی کھٹک پیدا ہوتی بھی تو مذہبی پیشوا اسے یہ کہہ مٹا دیتے تھے کہ تم صدقہ خیرات سے جو نیکی کے کام کرتے ہو' ان کا ثواب بہت بڑا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی اس خود فریبی کی بڑے دلنشیں انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم پہلے اپنے ہاں کے غریب

اید کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر لے چلتے ہیں، تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لاتے ہو۔ اور اپنے دل میں خوش ہو جاتے ہو کہ ہم نے بہت بڑا ثواب کا کام کیا ہے اور اسے فراموش کر دیتے ہو کہ جس مصیبت میں یہ غریب گرفتار ہیں اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ یاد رکھو تمہارے صدقہ و خیرات کے اس قسم کے کام اس جرم کا کفارہ کبھی نہیں بن سکتے۔ تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم خِزۡیٌ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو گے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا۔ (۲/۸۵)

(۵) معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو جاتی تھیں، نہ تو وہ ایک دوسرے کو ان سے روکتے تھے (۵/۷۹) اور نہ ہی ان کے مذہبی پیشوا انہیں ان سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ (۵/۶۳) کیونکہ ان کے اپنے مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔

(۶) ان کے اکابرینِ ملت (لیڈرانِ کرام) کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کاموں پر ان کی تعریف کریں جو وہ کر کے نہ دکھائیں۔ لوگ ان کی تعریف میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے اور وہ ان قصیدوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ (۳/۱۸۷)

(۷) مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے علماء اور مشائخ کو اپنا خدا بنا رکھا تھا۔ (۹/۳۱) کسی کو ان کے فیصلوں سے مجالِ سرتابی نہ تھی۔

(۸) عوام کی یہ حالت تھی؛ اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی یہ کیفیت کہ

ا۔ وہ غرور، نفرت اور تجبر و تمرد کے پیکر تھے۔ ان سے اگر کوئی علم و عقل کی بات کی جاتی تو وہ اسے یہ کہہ کر دھتکار دیتے کہ ہمارا علم مکمل ہے۔ ہمیں کسی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ (۲/۸۸)

ب۔ مذہب ان کا پیشہ تھا اور وہ چند ٹکوں کی خاطر جس قسم کا چاہو فتویٰ دیدیتے تھے (۲/۱۷۹) اور پھر تماشہ یہ کہ وہ ان فتووں کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے۔ لیکن لوگوں سے کہتے یہ تھے کہ یہ خدا کی شریعت ہے جسے ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (۲/۷۹)

ج۔ اسی دین فروشی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں۔ اس لئے وہ ہر اس آواز کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کرتے تھے جو لوگوں کو حق و صداقت کی دعوت دے۔ (۹/۳۴)

د۔ وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں ہمیشہ سر پھٹول ہوتی رہتی تھی۔ اور ان کی یہ فرقہ بندی اور اختلاف انگیزی کسی اصول کی بنا پر نہیں تھی بلکہ باہمی ضد اور رقابت کی وجہ سے تھی (۳/۱۹) ان کا سارا وقت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے میں صرف ہو جاتا تھا (۲/۱۱۳)

ہ۔ وہ جو کچھ دوسروں سے کہتے تھے اس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی کیفیت بس یوں سمجھئے جیسے کسی نے گدھے پر مقدس کتابوں کا انبار لاد دیا ہو۔ (۶۲/۵)

س۔ وہ لوگوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرو، جنت تمہارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ تم کبھی جہنم میں نہیں جاؤ گے۔ اور اگر کسی وجہ سے تمہیں جہنم میں بھیج بھی دیا گیا تو تمہارے بزرگ فوراً جا کر تمہیں چھڑا لائیں گے (۲/۸۰)، تم تو خدا کی چہیتی اولاد ہو۔ وہ تمہیں کیسے جہنم میں ڈال دیگا۔ (۵/۱۸)

(۹) قوم کو اعمال سے بیگانہ بنا دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ قانون و ضابطہ کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر شاق گزرتی تھیں۔ مثلاً انہیں کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن کاروبار کا ناغہ کیا کرو (جسے سبت کہتے ہیں) تو وہ ایسے حیلے اختیار کرنے لگ جاتے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح اس پابندی سے بچ جائیں۔ قانون کی طرف سے گریز کی راہیں نکالنا ان کا عام معمول بن چکا تھا۔ ($\frac{۷}{۱۶۳-۱۶۴}$)

(۱۰) ظاہر ہے کہ جس قوم کی حالت یہ ہو چکی ہو وہ کسی بلند مقصد کی خاطر ذراسی قربانی بھی نہیں دے سکتی اور جب وہ کسی چھوٹی موٹی قربانی کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتی تو حق کی خاطر جان دینے کا تو ان کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا چنانچہ کیفیت ان کی

یہ تھی کہ موت کے نام سے ان کی جان جاتی تھی۔ (۲/۲۴۳) نتیجہ یہ کہ ان کی ہزاروں لاکھوں کی جمعیت باہر نکلتی تھی لیکن جب دشمن سامنے سے آتا دکھائی دیتا تو وہ بھیڑوں، بکریوں کی طرح بھاگ اٹھتے اور ذلت کی موت مر جاتے تھے۔ (۲/۲۴۳)

(۱۱) اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں' اور تو اور' فوج کی جرنیلی کا معیار بھی دولت بن چکا تھا۔ یعنی ان مناصب کیلئے امیروں اور رئیسوں کے لڑکے منتخب کئے جاتے تھے۔ جوہر ذاتی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ (۲/۲۴۷) اور سپاہیوں میں ڈسپلن اس حد تک مفقود تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کچھ وقت کے لئے پیاس کو روکو، پانی مت پیو' تو وہ اتنی سی پابندی بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ (۲/۲۴۹)

یہ تھی اس قوم کی حالت جب' خدا کی آخری حجت' اور بنی اسرائیل کا آخری پیغامبر حضرت عیسیٰؑ' ان کیطرف مبعوث ہوئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حالت اُس وقت یہ تھی کہ یروشلم پر حکومت تو رومیوں کی تھی لیکن بنی اسرائیل پر اقتدار مذہبی پیشواؤں کا تھا یہی وجہ ہے جو آپ انجیل میں دیکھینگے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تلقین و توبیخ کا سارا رُخ ہیکل کے انہی پجاریوں کیطرف تھا۔ دیکھئے وہ انہیں کن الفاظ میں مخاطب کرتے' اور ان کی شان میں کیا کچھ کہتے تھے۔ وہ ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بیباک' حق گو پیامبرِ انقلاب کیطرح اُن سے کہتے :

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کیلئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو' اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانیوالو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر وہ مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو! کونسا بڑا ہے سونا یا مقدس جنے سونے کو مقدس کیا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہ یکی دیتے ہو' اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف' رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔ اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔

کبھی ان سے کہتے۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔۔۔۔ اے سانپو' اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔ (متی باب ۲۳' آیات ۱-۳۶)

اور وہ کبھی اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ

دیکھو! یہ فقیہ اور فریسی جو موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں' جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔۔۔۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھلانے کیلئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یہ تھے بنی اسرائیل کے علماء اور مشائخ کی حالت' اور یہ تھا وہ مشن جسے لیکر حضرت مسیحؑ آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ مذہبی پیشوا جو لوگوں کے خدا بنے بیٹھے تھے' اس تنقید کو کس طرح گوارا کر لیتے۔ انہوں نے حضرت مسیحؑ کیخلاف ایک متحدہ محاذ کھڑا کر لیا۔ وہ عوام کو تو یہ کہہ کر بھڑکاتے

سمجھے کہ یہ شخص تمہارے عقاید خراب کرتا ہے لیکن ان کی مخالفت کی جو حقیقی وجہ تھی اس کی پردہ کشائی انجیل برنباس میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ اس میں لکھا ہے۔

> تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے ..... تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی صدقے کے طور پر مانگیں۔

آپ نے غور کیا عزیزانِ من! کہ مسئلہ سارا معاشی تھا جسے وہ مذہب کا نقاب اوڑھا رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے جو کہا وہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ سیکولر نظامِ حکومت سے خوش رہتی ہے کہ اس میں گورنمنٹ کا تعلق سیاسی امور سے رہتا ہے اور مذہبی امور کے دائرے میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دین کے نظام میں مذہبی اور سیاسی دونوں دوائر حکومت کی تحویل میں ہوتے ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ :

> اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کرلیں بس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جا سکے گا جب تک وہ اللہ کی عبادت ویسے ہی نہ ہوتے دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس ۱۴۲)

چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ اس کے لئے انہوں نے حضرت مسیحؑ کے خلاف کفر و الحاد کا فتویٰ مرتب کیا اور اس جرم کی پاداش میں ان کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ وہاں کے مروجہ قانون کی رو سے ہیکل کے پجاری موت سے کم ہر قسم کی سزا خود دے سکتے تھے لیکن موت کی سزا کی توثیق حکومت سے کرانی پڑتی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے رومیوں کے گورنر سے فتویٰ پر دستخط کرا لئے۔ اور یہ نہ سمجھے کہ یہ حضرت مسیحؑ کا نہیں بلکہ خود ان کے اپنے قتل کا محضر نامہ (DEATH WARRANT) ہے جس پر وہ دستخط کرا رہے ہیں۔۔۔ وہ قتل نامہ جس پر قریب ستر سال بعد (سنہ ۷۰ء میں) خود رومیوں ہی کے ایک اور گورنر (طائیٹس) کے ہاتھوں اس طرح عمل ہوا کہ نہ ہیکل رہا اور نہ ہیکل کے یہ خدا۔

عذرا اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حضرت مسیحؑ جس قسم کا انقلاب لائے اس کی تفصیل قرآن کریم میں نہیں آئی۔ نہ ہی انجیل میں اس کی صراحت ملتی ہے البتہ ان دونوں میں ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے اس انقلاب کی ایک خفیف سی جھلک سامنے آجاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت مسیحؑ کے متبعین (حواریوں) نے آپ سے کہا کہ موجودہ نظام کی رو سے جو روٹی انسانوں کے ہاتھوں سے ملتی ہے وہ بڑی ذلت آمیز ہے۔ ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ رزق خدا کے ہاں سے ملے تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کا دست نگر اور محکوم نہ رہے۔ اس پر انہیں "آسمانی رزق" ملنے لگا۔ اس "آسمانی رزق" کے اشارات انجیل میں مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔ انجیل متی (باب ۱۱ آیت ۲۸) میں ہے کہ حضرت مسیحؑ کی دعوت یہ تھی کہ:

> اے محنت کشو! اے بوجھ سے دبے ہوئے مزدورو! سب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں آرام دوں گا۔

دوسری طرف وہ سرمایہ داروں سے کہتے ہیں کہ

> اپنے واسطے زمین پر مال ست جمع کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا لگتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے ہیں اور چراتے ہیں .....

> یاد رکھو! تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ (متی - ۶/۲۴-۱۹)

اس کے لئے انہوں نے جو عملی نظام قائم کیا تھا، اس کا نقشہ کتاب اعمال میں اس طرح کھینچا گیا ہے کہ:

> اور جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے۔ وہ اپنی جائداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (اعمال ۲/۴۵-۴۴)

دوسری جگہ ہے:-

> اور ایمانداروں کی جماعت ایک دل اور ایک جان تھی اور کوئی بھی اپنے مال کو اپنا نہیں کہتا تھا۔ ان کی سب چیزیں شریک تھیں .... اور ان سب پر فضل تھا کیونکہ ان میں کوئی بھی محتاج نہیں تھا۔ اس لئے کہ جو لوگ زمینوں اور گھروں کے مالک تھے ان کو بیچ بیچ کر بکی ہوئی چیزوں کی قیمت لاتے اور رسولوں کے پاؤں میں رکھ دیتے تھے۔ پھر ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جاتا تھا۔ (اعمال - ۴/۳۵-۳۲)

یہ تھا وہ اقتصادی نظام جسے جناب مسیح نے قائم فرمایا تھا۔

قرآن کی مخاطب قوم

یہ تھیں برادرانِ عزیز! اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں جنہیں قرآن کریم نے اپنی سب سے پہلی مخاطب قوم کے سامنے پیش کر کے ان سے کہا کہ یہ تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں، اور ان کے ساتھ ہی ان اقوام کی اجڑی ہوئی بستیوں کے وہ کھنڈرات بھی جن کے پاس سے تم اکثر گزرتے رہتے ہو۔ تم انہیں بنظرِ غائر دیکھو اور سوچو کہ یہ تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ جس قوم میں اس قسم کے جرائم پیدا ہوئے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ قوم تباہ و برباد ہو گئی۔ یہاں تک تو تم تاریخی شواہد سے دیکھ چکے ہو۔ اب اس کے بعد تم اس حقیقت کو سن لو کہ یہ کچھ محض اتفاقیہ طور پر نہیں ہو گیا۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو پہلے بھی کارفرما تھا اور آج بھی اسی طرح کارفرما ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔ (۳۳/۶۲)

خدا کی وہ روش جو اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں کارفرما تھی، تو اس روش میں کبھی تبدیلی نہیں پائیگا۔

تمہارا نظام بھی اسی قسم کا تخریبی ہے جیسا اُن اقوام کا تھا۔ اسلئے اگر تم نے اسے تبدیل نہ کیا تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان اقوام کا ہوا تھا۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ (۲۳/۴۴) جسطرح وہ مٹ گئیں اور ان کی صرف کہانیاں باقی رہ گئیں اسی طرح تم بھی تباہ ہو جاؤ گے اور تمہاری بھی فقط داستانیں باقی رہ جائیں گی۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ تم اپنے لئے کیا چاہتے ہو! شوکت و ثروت اور عزت و آبرو کی زندگی یا تباہی و بربادی کا ہولناک انجام!! جن سعید نفوس نے اس پیغام کو بگوشِ ہوش سنا انہوں نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور اس طرح بتدریج وہ جماعتِ مومنین وجود میں آگئی جس کا مقصدِ حیات ایسا نظام متشکل کرنا تھا جو مستقل اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو اور اس میں ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی نہ ہو جن کا نتیجہ قرآن نے امتوں کی ہلاکت بتایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے وہ نظام قائم کیا، اور

جماعتِ مومنین

آسمان کی آنکھ نے جہاں یہ عبرتناک مناظر دیکھے تھے کہ غلط نظام کے ہاتھوں بڑی بڑی شوکت و سطوت کی مالک قومیں کس طرح راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح اس نے یہ درخشندہ و تابناک منظر بھی دیکھا کہ صحیح اقدارِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے سے کس طرح ایک اونٹ چرانے والی قوم چند ہی دنوں میں تہذیب و تمدن کی ان بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ اس قوم کے جلو میں کسطرح کاروانِ انسانیت رواں دواں، اور

شاداں و فرحاں، اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھے چلا جاتا ہے، اس سکون و اطمینان کے ساتھ کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۶۲) (اس قافلہ کو بیرونی خطرات کا کوئی خوف ستاتا ہے اور نہ ہی افرادِ کارواں کے لئے قلبی حزن و ملال وجہ افسردگی اور موجب پریشانی بنتا ہے۔ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ۔

اس جماعت سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو ہر وقت سامنے رکھیں اور اپنی جانچ پڑتال کرتے رہیں کہ ان میں کوئی ایسی خرابی نہ پیدا ہونے پائے جو قوموں کی تباہی کا موجب بنا کرتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی چند ایک بنیادی اصولوں کو بھی یاد رکھیں: مثلاً

اصولِ حیات

(۱) تمہیں یہ مقام جسے استخلاف فی الارض کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے، ایمان اور عمل کے نتیجہ میں ملا ہے۔ (۲۴/۵۵) ایمان کے معنی ہیں مستقل اقدارِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم۔ اور عمل کے معنی ہیں ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی کی تشکیل۔ جب تک تمہاری یہ کیفیت رہے گی، تمہارا بلند و بالا مقام قائم و دائم رہیگا۔

(۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱) جو مقام کسی قوم کو حاصل ہوتا ہے وہ اس سے کبھی نہیں چھنتا جب تک وہ اپنے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرلے جو اسے اس مقام کا اہل نہ رہنے دے۔ نفسیاتی تبدیلی تعلیم و تربیت سے ہوتی ہے اسلئے اپنی آنیوالی نسلوں کی تربیت اس انداز سے کرنا کہ ان میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر واقع ہونے پائے جو انہیں تباہی کیطرف لے جائے۔

(۳) اپنے ہاں معاشی نظام اس قسم کا رائج رکھنا جس میں ذرائع پیداوار اور مال و دولت ہر ایک کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لئے کھلے رہیں۔ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ۔ (۴۷/۳۸) اگر تم نے اس قسم کے نظام سے اعراض برتا تو یاد رکھو تمہاری جگہ کوئی اور قوم آجائے گی۔ جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی۔ (۴۷/۳۸)

(۴) جب کسی قوم میں ظلم عام ہو جائے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ (۲۱/۱۱) ظلم کا مفہوم تو بڑا وسیع ہے لیکن اسکے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس شے یا جس شخص کو جس جگہ ہونا چاہیئے اسے وہاں نہ رکھنا ظلم ہے قوموں کی جڑ اس طرح کٹ جاتی ہے کہ خلقِ خدا ان کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۶/۴۵)

(۵) اور سب سے آخر یہ کہ دنیا میں حق اور باطل کی کشمکش ہر وقت جاری رہیگی تم باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلسل مصروفِ جد و جہد رہو، اور اس مقصد کیلئے تمہیں جان تک بھی دینی پڑے تو بلا تامل و توقف دیدو۔ اگر دنیاوی جاذبیوں نے تمہارا راستہ روک لیا اور تم نے جہاد سے گریز کیا تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا۔ (۹/۳۹) تمہاری جگہ دوسری قوم آجائیگی اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

یہ تھے عزیزانِ من! وہ اصول و ضوابط جو خدا نے اس قوم کو دیئے جس نے خدا کے نام پر مملکت قائم کی ——

اور وہاں سے آگے بڑھ کر آپ اس قوم کیطرف آجائیے جس نے تیرہ سو سال کے بعد ایک بار پھر خدا کے نام پر قائم کرنے کیلئے ایک مملکت کا مطالبہ کیا اور اسے وہ مملکت عطا کر دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس مملکت اور اسکی حامل قوم کا مستقبل کیا ہے؟

ملّتِ پاکستانیہ

(؟) اس سوال کا جواب معلوم کرنا اس قوم کیلئے ذرا بھی مشکل نہیں جسے اس حقیقت پر ایمان ہو کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ قوموں کے عروج و زوال سے متعلق قوانینِ خداوندی اٹل ہیں۔ انہی کے مطابق اقوامِ سابقہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوا تھا۔ انہی کی رو سے ہمارے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ؟ اقوامِ سابقہ کے سامنے تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں۔ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۳/۱۳۶) تم دنیا میں چلو پھرو۔

اور نگہ بصیرت سے دیکھو کہ جن اقوام نے ان قوانین کو جھٹلایا تھا ان کا انجام کیا ہوا۔ اور اس کے بعد کہا کہ یہ حقیقت کسی خاص قوم، خاص زمانے یا خاص مقام تک محدود نہیں۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ۔ یہ تو عالمگیر انسانیت کے لئے واضح حقیقت ہے وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۳/۱۳۸)، دنیا کی جو قوم بھی چاہے کہ وہ ان خطرات سے محفوظ رہے جن سے اقوام سابقہ دوچار ہو کر تباہ ہوئی تھیں، تو وہ انکے احوال و کوائف سے عبرت اور ان قوانین سے راہ نمائی حاصل کرے۔

لہٰذا ہمیں دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ کونسی خرابیاں تھیں جو اقوام سابقہ کی تباہی کا موجب بنیں، اور پھر اس کا جائزہ لینا کہ وہ خرابیاں ہمارے ہاں تو نہیں پیدا ہو گئیں۔ یہ خرابیاں قوم بہ قوم گنائی جا چکی ہیں لیکن چونکہ ہم کافی لمبی مسافت طے کر آئے ہیں جس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اس سفر کے بعض سنگ میل ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہوں۔ اسلئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان خرابیوں کی مختصر سی فہرست ایکبار پھر سامنے لے آئی جائے تاکہ اس سے تجدید یادداشت ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم حقیقت کو اچھی طرح سامنے رکھئے کہ بنیادی جرم تو دراصل ایک ہی ہے جس سے قوموں کی تباہی ہوتی ہے۔ یعنی وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار سے بے اعتنائی برتنا اور معاشرہ کا نظام اپنے خود ساختہ قوانین و ضوابط کے مطابق متشکل کرنا۔ باقی جرائم اسی اصل کی مختلف شاخیں ہیں لیکن وہ جرائم نمایاں اور محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اسلئے انکے تذکرہ سے بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اب ان جرائم کی فہرست ملاحظہ فرمایئے جن کی وجہ سے اقوام سابقہ تباہ ہوئی تھیں۔

تباہ کن جرائم کی فہرست

(۱) جب کسی معاشرہ میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں، عزت کا معیار دولت قرار پا جائے اور محنت اور دستکاری سے روٹی کمانے والوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قوم نوح کے ساتھ ہوا۔

(۲) جب قومیت کا معیار ایمان یا نظریۂ حیات کے اشتراک کے بجائے، رنگ، نسل، وطن کا اشتراک قرار پا جائے تو اس کا نتیجہ بھی تباہی ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے سامنے آتی ہے۔

(۳) جو قوم جور و جبر سے حکومت کرے اور دوسروں کی محنت کی کمائی کا استحصال (EXPLOITATION) اپنا شعار ہو وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی خواہ وہ تمدن و تہذیب کی کتنی بلندیوں تک کیوں نہ پہنچ چکی ہو اور علوم و فنون میں کتنی ہی آگے کیوں نہ بڑھ گئی ہو۔ قوم عاد کی سرگزشت یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

(۴) جس معاشی نظام میں ذرائع پیداوار۔ یعنی زمین اور اسکے متعلقات۔ پر ذاتی ملکیت جائز قرار دیدی جائے اور اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کیلئے کھلی نہ رہنے دی جائے اس نظام اور اسکے حامل قوم کو دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ قوم ثمود کی سرگزشت اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

(۵) جس قوم کا کاروبار سرمایہ داری کے اصول پر قائم ہو یعنی اس میں سرمایہ دار طبقہ کو کھلی چھٹی ہو کہ وہ محنت کشوں کو جو جی میں آئے دے اور صارفین (CONSUMERS) سے جتنا جی چاہے وصول کرلے، وہ ماپ اور تول کے پیمانے اپنی منفعت اور مصلحت کے مطابق رکھے اور اس پر اس سے باز پرس کرنیوالا کوئی نہ ہو۔ وہ قوم تباہ ہو کر رہتی ہے۔ یہ حقیقت قوم حضرت شعیبؑ کی سرگزشت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

(۶) اور اسی قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت بھی کہ جب مذہب کا دائرہ پوجا پاٹ تک محدود کر دیا جائے اور انکی ہر ایک کو آزادی ہو لیکن کاروباری معاملات میں اسے دخل نہ دینے دیا جائے یعنی جہاں نظام سیکولر ہو۔ وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔

(۷) اور قوم لوط کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم میں جنسی ضوابط اور پابندیوں سے بے اعتنائی برت کر فحاشی اور جنسی بدنہادی کو عام ہونے دیا جائے اس قوم کی کشتی بحر حیات میں ڈوب جاتی ہے۔

(۸) قوم فرعون کے انجام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس قوم کی سیاست میں انداز ملوکانہ پیدا ہو جائیں وہ قوم غرق ہو جاتی ہے۔ انداز ملوکانہ کی ابھری ہوئی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں حکمرانی قانون کی نہیں ہوتی، ایک فرد یا افراد کے مجموعے کے فیصلوں کی ہوتی ہے۔ اس میں قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا

جاتا ہے اور پھر پارٹیوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر ان کی اجتماعی قوت کو کمزور سے کمزور تر کیا جاتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کو آگے بڑھایا جاتا ہے جن میں جوہرِ مردانگی نہ ہو تاکہ وہ ہمیشہ ہئیتِ حاکمہ کے تابع فرمان رہیں جن لوگوں میں ذرہ برابر بھی غیرت و حمیت کے آثار نمودار ہوں انہیں کچل کر رکھ دیا جائے۔

نیز اس نظام میں رزق کے سرچشمے قوم کی تحویل میں رہنے کے بجائے ہئیتِ حاکمہ کی ذاتی ملکیت مقصود ہوتے ہیں اور اس طرح یہ حکمران طبقہ قوم کا ان داتا بن کر انہیں انگلیوں پر نچاتا رہتا ہے۔ اس مقصد کیلئے یہ طبقہ مذہبی پیشواؤں کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اپنے حریفوں کو ان کے سپرد کر دیتا ہے تاکہ وہ عوام کے جذبات کو بھڑکا کر انہیں ختم کر کے رکھ دے۔

(۹) قوم بنی اسرائیل گویا ان تمام جرائم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ ان کا نظامِ زندگی ربا اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر استوار تھا عصرِ حاضر کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ ان کا نظام کیپٹل ازم اور تھیاکریسی کے ستونوں پر قائم تھا۔ سرمایہ داروں کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ جس طریقے سے چاہیں دولت سمیٹتے چلے جائیں، بشرطیکہ وہ صدقے اور خیرات کے کاموں میں چندہ دیا کریں اور مذہبی پیشواؤں کے اقتدار کو قائم رکھیں۔ انکے لیڈروں کی یہ حالت تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ لوگ انکی جھوٹی تعریفیں کرتے رہیں اور وہ کرکے کچھ نہ دکھائیں بلکہ محض بیان بازی کے زور پر پاپولیریٹی (POPULARITY) حاصل کرتے رہیں۔ جہاں تک مذہبی پیشواؤں کا تعلق ہے مذہب ان کا پیشہ تھا اور دین فروشی ان کا ذریعہ معاش۔ وہ اپنے جی سے شریعت کے مسائل گھڑتے اور انہیں خدا کا دین کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ قوم مختلف مذہبی فرقوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان فرقوں کے امام، ایک دوسرے پر کفر کے فتوے عائد کر کے عوام کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ حکام کے ساتھ ان کی سازباز تھی۔ اور جس شخص کو دیکھتے کہ وہ ان کی مفاد پرستیوں کے راستے میں حائل ہے، اس پر کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کر کے اسکی موت کے احکام صادر کرا لیتے۔

یہ تھے اس قوم کے کبیرہ جرائم جن کا نتیجہ ان کی ایسی تباہی تھی جو دنیا میں ضرب المثل بن کر رہ گئی۔ اس قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم کے معاشرہ میں یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! ان جرائم کی فہرست جن کی وجہ سے اقوامِ سابقہ اپنے اپنے وقت میں تباہ و برباد ہو گئیں۔ ان کی سرگزشتوں کو

باز بخویشتن نگر

قرآنِ کریم نے اس لئے بیان کیا ہے کہ ان کی روشنی میں ہم خود فیصلہ کریں کہ ہمارا مستقبل کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقائق اس قدر واضح اور یہ معیار اس قدر نکھرا ہوا ہے کہ اسکی موجودگی میں یہ معلوم کرنے کیلئے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا، کسی کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں۔ خدا کے قوانین اٹل ہیں اور ہماری حالت بالکل بے نقاب۔ آپ سوچئے کہ قوموں کو تباہ کرنے والے جرائم کی جو فہرست قرآنِ کریم نے پیش کی ہے ان میں کوئی ایک جرم بھی ایسا ہے جو ہمارے معاشرہ میں عام نہ ہو چکا ہو اور اس کے بعد سوچئے کہ اگر ہماری حالت یہی ہے اور ہم اپنے موجودہ نظام کو نہ بدلیں تو دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں تباہ ہونے سے بچا سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے بہی خواہانِ ملت قوم کو تباہی سے بچانے کے مختلف طریقے سوچ رہے ہیں لیکن معاف فرمائیے اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ ان سب کی نگاہ علاماتِ مرض پر ہے علتِ مرض پر نہیں، ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ اگر ہم زیادہ سے زیادہ عسکری قوت حاصل کر لیں تو پھر ہم ہر طرح سے محفوظ اور مامون رہ سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عسکری قوت، قوموں کی حفاظت اور بقا کے لئے لاینفک ہے اور اس کے فراہم کرنے کی قرآن بڑی تاکید کرتا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عسکری قوت کو اگر حدودِ خداوندی کے تابع نہ رکھا جائے تو خود وہی قوت قوم کو تباہ کرنے کا موجب بن جایا کرتی ہے۔ دیکھئے وہ نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کیسے واشگاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ ان لوگوں کو اپنی قوت پر بڑا ناز ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو جی میں آئے کریں ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کہا کہ ان سے کہہ دو کہ ذرا تاریخی شواہد پر نگاہ ڈالو وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ ۔ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۔ (۴۷/۱۳) کتنی قومیں ایسی تھیں جنہیں تم سے کہیں زیادہ قوت

حاصل تھی لیکن جب انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی برتی تو انکی قوت انکے کسی کام نہ آئی۔ وہ تباہ و برباد ہوگئیں اور کوئی انکی مدد تک کو نہ پہنچا۔

بعض زور دیتے ہیں کہ یہ دور سائنسی ایجادات کا ہے اسلئے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی پر زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہیئے۔ یہ دور سائنٹیفک ترقیوں کا ہو یا نہ ہو قرآن کریم نے تو آج سے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا تھا کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا وجہ امتیاز آدمیت ہے۔ اسلئے سائنٹیفک ترقیاں ہمارا فریضہ ہے۔ لیکن اگر سائنٹیفک ایجادات کو مستقل اقدار کے سوالمل کا پابند نہ کیا جائے تو

اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس نے کہا ہے کہ تم اقوام گزشتہ کے تاریخی واقعات کو دیکھو۔ تمہیں ان میں ایسی ایسی قومیں نظر آئیں گی جنہیں سماعت، بصارت اور ذہن رسا کی اعلیٰ درجے کی صلاحیتیں حاصل تھیں لیکن فَمَا اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶) لیکن جب انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کے علم و ہنر کی صلاحیتیں ان کے کسی کام نہ آئیں اور وہ انہیں اس تباہی سے ذرا بھی محفوظ نہ رکھ سکیں جس کے متعلق وہ کبھی (SERIOUSLY) سوچا نہیں کرتے تھے۔ وہ ان قوانین و اقدار کو مذاق سمجھتے تھے۔ لیکن فیصلہ کن حقیقتیں وہی ثابت ہوئیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے خود مغربی محققین بھی اپنی مدت العمر کی تحقیق و تفتیش کے بعد تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ مثلاً شہرہ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) کا مصنف بریفا لکھتا ہے۔

> اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہوگئی ہے۔ وہی سوئیلی فکنٹ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کے تولنے کے قابل ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اسکے جوہر ذاتی میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔ قوت، تہذیب، کلچر سب بے معنی ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جا سکتی ہے اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ (THE MAKING OF HUMANITY – P. 259)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل مسئلہ روٹی کا ہے۔ اگر اسے حل کر لیا جائے تو تمام خرابیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ قرآن کریم روٹی کے مسئلہ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بھوک خدا کا عذاب ہے اور رزق کی فراوانیاں اس کی نعمتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ اگر رزق کی فراوانیوں کو مستقل اقدار کے تابع نہ رکھا جائے تو وہی فراوانیاں معاشرہ کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں سورۃ قصص میں ہے۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۲۸/۵۸) کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں رزق کی فراوانیاں حاصل تھیں لیکن اسکے باوجود وہ تباہ ہوگئیں۔ یہ ہیں انکے اجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے بلکہ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس طرح چراغ سحری بجھنے سے پہلے اور تیزی سے جگمگاتا ہے' اسی طرح جب کسی قوم کے ہلاکت کے دن قریب آجاتے ہیں تو ان کے ہاں دولت سیلاب کی طرح امنڈ کر آجاتی ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۶/۴۴) ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم ان اقدار کو فراموش کر دیتی ہے جن کی انہیں اکثر یاد دہانی کرائی جاتی رہتی ہے تو ان پر سامان زیست کے پھاٹک کھل جاتے ہیں اور جب وہ دولت و ثروت کی اس قدر فراوانیوں کی رو میں بہ جاتے ہیں تو ان پر اچانک تباہی آجاتی ہے۔ ایسی تباہی کہ انہیں بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے تنہا روٹی کے مسئلہ کا حل بھی کسی قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ قوموں کے لئے تباہی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے وہ بنیادی اصول جس سے ہر آسمانی پیامبر انقلاب نے اپنی دعوت کا آغاز کیا یعنی اُعْبُدُوا اللّٰهَ جس سے مراد یہ ہے کہ

زندگی کے ہر گوشے میں اقدارِ خداوندی کی اطاعت کی جائے جب کلی ہیئت اجتماعیہ یعنی نظامِ معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو وہ قوم ہر لحاظ سے اعلونؔ کے مقام پر پہنچ جاتی ہے یعنی دنیا کی کوئی قوم اکا ہمدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر وہ ان اقدار سے بے اعتنائی برتتی ہے تو سیاسی غلبہ، تسلط، عسکری قوت، وحشت، یا معاشی فراوانی و فراخی اسے تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ ایک بار پھر برفاؔ کے الفاظ سنئیے۔ وہ کہتا ہے۔

> انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں چلایا جائے۔ وہ نظام تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ (۵۹/۲۳)

یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کریم کا آخری فیصلہ جس کی تائید خود مغرب کے دیدہ ور بھی کر رہے ہیں۔ ہم نے قرآن کریم کی روشنی میں ان اقوام کی سرگزشتوں کا مطالعہ کر لیا ہے جو اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہو گئیں اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ان اقوام میں اگر وہ کبائر الاثم ایک ایک دو دو کر کے ابھرے تھے تو پاکستان میں وہ سب کے سب یکجا ہو چکے ہیں اور دن بدن زیادہ سے زیادہ پھیلتے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے متعلق خدا کے قانونِ مکافات کا فیصلہ واضح ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ صورتِ حالات بڑی مایوس کن ہے لیکن ابھی امید کی کچھ کرنیں باقی ہیں۔

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں

قرآن کریم ہی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ غلط نظام کے تباہ کن نتائج آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں اور انکی آخری شکل وہ ہوتی ہے جب تباہی محسوس طور پر اس قوم کے سامنے آجاتی ہے۔ اگر وہ قوم اس سے پہلے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلے تو اسکے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے لیکن جب تباہی محسوس شکل میں سامنے آجائے تو پھر وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ دیکھئے سورۃ الانبیاء میں اس حقیقت کو کیسے محاکاتی انداز میں (GRAPHICALLY) بیان کیا گیا ہے فرمایا۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جو اپنے اس نظام کی وجہ سے جو ظلم اور ناانصافی پر مبنی تھا تباہ ہو گئیں۔ ان کی حالت یہ تھی کہ انہیں انکی غلط روش کے تباہ کن مآل سے آگاہ کیا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم جس روش پر چل رہے ہیں اس سے ہمیں فروغ حاصل ہو رہا ہے اس لئے اس کا نتیجہ تباہی کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اسکے نتائج غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جب یہ مدت ختم ہو گئی فَلَمَّا اَحَسُّوْا بَاْسَنَا اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ۔ اور ان کی تباہی محسوس شکل میں انکے سامنے آگئی تو وہ لگے بھاگنے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکار کر کہا لَا تَرْكُضُوْا۔ بھاگو نہیں۔ تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ وَارْجِعُوْا اِلٰى مَا اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ۔ چلو اپنے محلات کیطرف اور اس سامانِ تعیش کیطرف جو تم نے اس طرح فراہم کر رکھا تھا۔ چلو واپس تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے اتنا مال و دولت کہاں سے لیا تھا۔ وہ مظلوم کونسے تھے جنکے خون کی رنگینی تمہارے محلات کے لئے وجہِ آرائش و زیبائش بنی تھی۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ چنانچہ جب انہیں گرفتار کر کے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ہم نے یہ سب کچھ ظلم و استحصال سے حاصل کیا تھا۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۲۱/۱۱-۱۵) وہ یہ واویلا مچاتے رہے لیکن اس وقت اس پکار اور فریاد نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا اور وہ قوم ایسے ہو گئی جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت ہو یا بجھا ہوا شعلہ۔

لہٰذا عزیزانِ گرامی قدر! اگر کسی کے دل میں فی الواقعہ پاکستان کا درد ہے اور اس قوم کو تباہی سے بچانے کی تمنا اسکے سینے میں موجزن تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ مملکت کو قرآنی اقدار کے تابع لے آئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ یہ مملکت ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو جائیگی بلکہ عزت و ثروت کے اس مقامِ بلند پر پہنچ جائیگی جہاں سے انسان اپنے مقدر کے ستارے جھک کر دیکھا کرتا ہے۔ یاد رکھئیے! اس قوم کو نہ سیاسی ہیرو بازیاں بچا سکتی ہیں نہ آئینی فسوں سازیاں۔ نہ معاشی شعبدہ کاریاں اسے سنبھالا دے سکتی ہیں نہ انتخابی ابلہ فریبیاں۔ اسے بچا سکتی ہیں تو صرف مستقل اقدار خداوندی کی جنت سامانیاں۔ اگر ان سے اعراض برتا گیا تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ یہی خدا کی سنتِ مستمرہ ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ اور سنت اللہ کبھی بدلا نہیں کرتی۔ یاد رکھئیے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف (اقبالؔ)

والسلام

الہ دین کا جنّ

پرویز صاحب نے، طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں اپنے ایک خطاب میں جس کا عنوان تھا ـــ "قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے، ہنگاموں سے نہیں" ـــ کہا تھا۔

"تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں عقل و فکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں، انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلابِ بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں بھی نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ اس لئے مملکتِ پاکستان، جو ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے، اس کا کیا مقابلہ کر سکیگی۔ جب ۱۹۶۸ء کے ہنگامے پورے زوروں پر تھے تو میں نے ان کے آتش برداروں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ ان کو قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون شکنی دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب بیگانے اس کا شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں گاندھی نے (QUIT INDIA) کی تحریک شروع کی اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بیباک چھوڑ دیا تو اس نے قائداعظمؒ کو بھی دعوت دی تھی کہ جب انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے۔ یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کا احترام سکھلائیے، قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے۔ ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو آج جس سیلاب کا رُخ انگریز کی طرف ہے کل کو اس کا رُخ خود آپ کی سمت ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہیگا۔ یہی کچھ میں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے اور اس کے اس عفریتی رقصِ آتش پر جشنِ مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ الٰہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخورِ اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی قانون شکنی کے خوگر عناصر ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے ہیں اور حکومت سے فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے۔ لیکن اب انہیں کون روک سکتا ہے!

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ لاقانونیت (LAWLESSNESS) کی زد میں آرہا ہے۔"

اس کے بعد بھی وہ اپنی اس پکار کو برابر دہراتے رہے لیکن کسی نے اس فغانِ جگر پاش کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ہر ایک نے اپنے اپنے جِنّ بوتلوں سے نکالنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ اب کیفیت یہ ہے کہ یہ بدنصیب ملک انہی جنات کی وحشت سامانیوں اور خرمن سوزیوں کی آماجگاہ بن چکا ہے اور جس آگ سے یہ کھیل رہے ہیں اس کی شعلہ انگیزیاں دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ ہر صبح جو اخبار آتا ہے اس میں سُرخیوں سے ان کی پیدا کردہ تباہیوں اور بربادیوں کی خبریں آتشیں حروف میں لکھی ملتی ہیں۔ ایک تو ہم ان خبروں کے عادی سے ہوگئے ہیں اور دوسرے اخبارات کی اثر انگیزی کی عمر صرف ایک دن ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں مجموعی طور پر اندازہ نہیں ہوتا کہ ہماری تباہیاں کس حد تک بڑھ چکی ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے گذشتہ آٹھ دس دنوں کے دو تین اخبارات ہیں۔ آیئے ہم آپ کو بتائیں کہ ان میں ان جنات کی فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کی کس کس قسم کی خبریں ملتی ہیں۔ سمجھنے کی خاطر ہم ان ہنگاموں کو ذیل کی شقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) مزدوروں اور کارخانہ داروں کے تصادمات۔

(۲) مزارعین اور زمینداروں کے تزاحمات

(۳) طلبار کی ہنگامہ خیزیاں

(۴) قیدیوں اور اربابِ نظم و نسق کا ٹکراؤ۔

(۵) قتل و خون ریزیوں کے عام واقعات۔

ہم ان تصادمات کے اہم گوشوں تک محدود رہیں گے۔ ان کی تفصیلات میں نہیں جائینگے۔

(۱) مزارعوں اور کارخانہ داروں کے تصادمات

لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ مشرق کی ۲ جون کی اشاعت میں ایک تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں مزدوروں اور کارخانہ داروں کے باہمی ٹکراؤ کے حسبِ ذیل واقعات سامنے آئے ہیں۔

(۱) کراچی میں احمد حلوہ ایمپلائز یونین اور مالکان کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا۔ ایک روز ان مزدوروں اور مالکوں میں باہمی گفتگو ہو رہی تھی کہ چند مزدوروں نے غصہ میں آکر ایک مالک پر کڑھائی کا جلتا ہوا گھی انڈیل دیا اور وہ بُری طرح جھلس گیا۔ آجکل وہ ہسپتال میں زیرِ علاج ہے۔

(۲) ولیکا ٹیکسٹائل ملز کراچی کے مزدوروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے مل کا گھیراؤ کیا۔ گھیراؤ اتنا سخت تھا کہ تین دن تک نہ تو کوئی فیکٹری کے اندر جا سکتا تھا نہ باہر آ سکتا تھا۔ مل کا ایک افسر تین دن تک بھوکا پیاسا مل کے اندر بند رہا۔ اور چوتھے دن اسے کچھ کھانے کو مل سکا۔

(۳) کراچی کے صنعتی علاقہ میں قالین بافی کے ایک کارخانے کے مزدوروں نے اپنی قوت کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ کارخانے کے پروڈکشن مینیجر کو ننگا کر کے اسے سارے کارخانے میں گھمایا۔

(۴) گزشتہ فروری میں کوہ نور ریان ملز (واقعہ کالا شاہ کاکو) کے مزدوروں نے حکومت کے مقرر کردہ مینجنگ ڈائریکٹر کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا اور قریب بیس انجینئروں کو برطرف کر کے مل پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔ اس صنعتی ادارہ کو تھوڑا عرصہ پہلے ہی حکومت نے اپنی تحویل میں لیا تھا۔

(۵) لاہور کی "سیون اپ فیکٹری" میں مزدوروں اور انتظامیہ میں تصادم ہوا جس کے نتیجے میں ایک مزدور ــــ صوفی نذیر احمد مارا گیا۔

(۶) اس سے کچھ روز پہلے اتفاق فونڈری (لاہور) میں مزدوروں نے فیکٹری کا گھیراؤ کیا تو مالکان نے حفاظتِ خود اختیاری کے نام پر گولی چلا دی جس سے کئی مزدور زخمی ہو گئے۔ مزدوروں نے اس فیکٹری کے علاوہ ایک اور فیکٹری ــــ سلطان فونڈری۔ پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔

(۷) دارو غہ والا (لاہور) میں واقعہ سن شائن بسکٹ فیکٹری کے مزدوروں نے پہلے فیکٹری کا گھیراؤ کیا اور پھر انتظامیہ کو بے دخل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ فیکٹری کے مالک نے طاقت کا استعمال کیا جس سے ایک مزدور کی جان ضائع ہو گئی۔

(۸) سن شائن کے حادثہ کے فوری بعد مشتعل مزدوروں اور پولیس میں تصادم ہو گیا۔ مزدوروں نے پولیس کے سپاہیوں سے رائفلیں چھین لیں اور تین کانسٹیبلوں کو زخمی کر دیا۔

(۹) زیب تن ٹیکسٹائل مل کراچی کے مزدوروں نے مالک کی رہائش گاہ پر ہلہ بول دیا۔ اس کے گھر کے اندر توڑ پھوڑ کی فحش کلامی کی اور مالک کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی۔ اس کے بعد ان مزدوروں نے سندھ سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا اور تمام وزراء اور افسر اپنے اپنے کمروں میں بند ہو کر رہ گئے۔ حکومت کو پولیس منگانی پڑی۔

(۱۰) لگے دنوں لائلپور کا ایک صنعت کار عبدالخالق 'مزدوروں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

(۱۱) کراچی میں حال ہی میں مزدوروں اور پولیس کے درمیان جو لرزہ انگیز تصادم ہوا ہے اس کی تفصیلات نے ملک کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ ۸ جون کے نوائے وقت میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق 'پولیس کی فائرنگ سے (۲۹) افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے ہیں۔ اور مساوات بابت ۱۲ جون میں شائع شدہ خبر کے مطابق 'وہاں کی مزدور کالونی میں مسلح افراد آزادانہ گھوم رہے ہیں۔ اس ہنگامہ کو فرو کرنے کے لئے حکومت کو فوج طلب کرنی پڑی۔

(۱۲) ان روز روز کی فساد انگیزیوں اور ہنگامہ خیزیوں سے تنگ آ کر کراچی ملز ایسوسی ایشن کے صدر' دادا بھائی نے کہا ہے کہ حکومت یا تو صنعتی امن قائم کرے یا ان کے ایک سو بیس کارخانوں کا انتظام سنبھال لے۔ اگر ان دونوں صورتوں میں سے کسی پر بھی عمل نہ کیا گیا تو ہم ملیں بند کر دیں گے کیونکہ موجودہ حالات میں ملز کے مالکان اپنے آپ کو بالکل غیر محفوظ پاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مزدوروں کی بدامنی کی وجہ سے 'کپڑے کی صنعت میں' ہڑتالی شروع سے اس وقت تک دس کروڑ روپے کے زرمبادلہ کا نقصان ہو چکا ہے۔ (امروز۔ ۳۰ مئی ۱۹۷۲ء)

یہ ہیں چند ایک چیدہ چیدہ خبریں ان ہنگاموں کی جو پچھلے دنوں صنعتی اداروں میں رونما ہوتے ہیں۔ ان کا سلسلہ دن بدن پھیلتا چلا جا رہا ہے اور اب تک شاید ہی کوئی ادارہ ایسا ہو جس میں کسی نہ کسی انداز سے بدامنی پیدا نہ ہو چکی ہو۔ اس سلسلہ میں پرویز صاحب نے اپنے اکتوبر ۱۹۷۱ء کے خطاب میں جو کچھ کہا تھا وہ اربابِ بصیرت کے لئے غور طلب ہے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کی طرف سے پیش کردہ معاشی تحریک (اسلامی سوشلزم) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اس سے بھی آگے مجھے ایک اور خطرہ نظر آ رہا ہے جس کے تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس معاشی تحریک میں لوگوں کو جس قدر سنہرے خواب دکھائے جا رہے ہیں' اس سے ان کے دل میں یہ یقین پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ جونہی ہماری پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی ہم میں سے ہر ایک کے پاس بنگلہ، موٹر، کارخانہ، سینکڑوں مربعے زمین، چاندی سونے کے ڈھیر لگے ہونگے۔ اور انہی تصورات کی کشش ہے جو انہیں اس تحریک کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ پارٹی برسرِ اقتدار آ بھی گئی تو عوام کے ساتھ کئے گئے اس قسم کے وعدے کبھی پورے نہیں ہو سکیں گے۔ ان کا راتوں رات پورا کرنا کسی کے بس کی بھی بات نہیں رہے گی۔ اُس وقت یہ لوگ مایوس ہو جائینگے۔ اور جب مایوس (DESPERATE) ہو جائے تو اس کی تباہ کاریاں حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب بلّی کسی ایسے کمرے میں گھِر جائے جس سے باہر نکلنے کے سب راستے مسدود ہوں تو وہ آنکھیں نوچ لیا کرتی ہیں۔ علم النفس کی رُو سے مایوسی (FRUSTRATION) کا ردِعمل شدید قسم کا (AGGRESSION) ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے ابلیس اور شیطان ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ ابلیس کے معنی ہیں مایوسی اور شیطان کے معنی ہیں سرکشی۔ جب ابلیس شیطان بن جاتا ہے تو قرآن اُسے عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ کہہ کر پکارتا ہے یعنی تمہارا کھلا ہوا دشمن۔ یہ ہے وہ خطرہ جس کا احساس میری روح پر کپکپی طاری کر دیتا ہے کہ جب یہ لوگ مایوس ہونگے تو ان کے ہاتھوں یہاں کسی کا کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا ——— خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے۔!"

مایوسی کی سرکشی

جو کچھ ملک میں اس وقت ہو رہا ہے' وہ اسی کا نتیجہ ہے!

(٭)

۲۔ مزارعین اور زمینداروں میں تصادم

ان تصادمات کا سلسلہ سرحد سے شروع ہوا تھا اور ان میں جس قدر خون ریزیاں ہوئی تھیں' ان کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ ان تنازعات کا سلسلہ ختم ہونے کے بجائے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۸ جون میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق "سیدو شریف (سوات) سے قریب پندرہ میل دور" ایک گاؤں میں مزارعین اور ملیشیا میں تصادم ہوا جس میں فریقین دو روز تک ایک دوسرے پر فائر کرتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں بہت سے افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔ اور روزنامہ مشرق (بابت ۴ جون) میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق "لائل پور' دیپالپور اور شیخوپورہ میں زمین پر قبضہ دلانے کے سلسلہ میں باہمی تنازعات ہوئے جس کے نتیجے میں پانچ افراد قتل ہو گئے۔"

ان فسادات کی آگ اُس وقت اور بھی زور سے بھڑکے گی جب زرعی اصلاحات کی رُو سے حاصل شدہ اراضی کی الاٹمنٹ شروع ہو گی۔ زرعی اصلاحات پر تنقید کرتے ہوئے ہم نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا تھا' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (تجدید یادداشت کے لئے) اُسے دوبارہ سامنے لایا جائے۔ ہم نے لکھا تھا:-

"اس اسکیم کے نقائص کا ذکر تو بعد میں آئے گا سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ جس طریق سے اس کی پبلسٹی کی گئی ہے وہ اگر خطرناک نہیں تو کم از کم نہایت مایوس کن نتائج پیدا کرنے کا ذمہ دار ضرور ہے۔ اس پبلسٹی سے ہر اُس کاشتکار کے دل میں جس کے پاس اس وقت اپنی کوئی زمین نہیں یا ۱۲½ ایکڑ سے کم زمین ہے' یہ خیال راسخ ہو گیا ہے کہ بس چند دنوں کی بات ہے

اس کے بعد میں ساڑھے بارہ ایکڑ زمین کا مالک بن جاؤں گا۔ اس سے ان لاکھوں بےنوا انسانوں کے دل میں جو حیات بخش آرزوئیں بیدار ہوگئی ہیں ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن عملاً اس اسکیم کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا۔ اس وقت جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں اُن کی رُو سے پوزیشن یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں:۔

(۱) قریب (۱۹) لاکھ کاشتکار ایسے ہیں جن کے پاس چپہ بھر زمین بھی اپنی نہیں۔

(۲) قریب (۷) لاکھ ایسے ہیں جن کی ایک ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں۔ اور

(۳) قریب (۳۶) لاکھ ایسے ہیں جو (۱۲½) ایکڑ رقبہ سے کم کے مالک ہیں۔ (پاکستان ٹائمز ۲؍۳)

یہ ہیں وہ باسٹھ لاکھ افراد جن کے دل میں اس اسکیم کی پبلسٹی سے امیدوں کی شمعیں روشن ہوگئی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں اس اسکیم کی رُو سے زیادہ سے زیادہ تیس لاکھ ایکڑ اراضی حکومت کو بلا معاوضہ حاصل ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک کاشتکار کو دس ایکڑ اراضی بھی دی گئی تو اس سے زیادہ سے زیادہ تین لاکھ کاشتکار متمتع ہوسکیں گے۔ یعنی باقیوں کو تو چھوڑیئے، اُن انیس لاکھ میں سے جن کے پاس چپہ بھر زمین بھی نہیں، صرف تین لاکھ افراد اس اسکیم کی رُو سے نفع یاب ہوسکیں گے۔ ان میں سے سولہ لاکھ اور کل میں سے (۵۹) لاکھ ویسے کے ویسے رہ جائیں گے۔ آپ سوچئے کہ جس وقت زمین کی عملی تقسیم شروع ہوئی، ان (۵۹) لاکھ کے دل پر کیا گزرے گی جو اس وقت اس امید پر بھنگڑے ڈال رہے ہیں اور چراغاں کر رہے ہیں کہ وہ چند دنوں میں (۱۲½) ایکڑ اراضی کس کے مالک بننے والے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس اسکیم کو عام کرتے وقت ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر، کاشتکاروں کو حقائق سے آگاہ کیا جاتا اور انہیں بتایا جاتا کہ سردست اس اسکیم سے صرف اتنے کاشتکاروں کو فائدہ پہنچ سکے گا۔

زرعی اصلاحات سے متعلق مارشل لاء کا آرڈر میں کہا گیا ہے کہ حاصل کردہ زمین ان مزارعوں کو (بلاقیمت) دی جائیگی، جن کے زیر کاشت وہ رقبہ ہوگا۔ اس سے اس قدر الجھنیں پیدا ہوں گی جن کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ (مثلاً) ایک زمیندار کا رقبہ دس مزارعوں کے زیر کاشت ہے لیکن وہ (۱۵۰) ایکڑ سے زاید نہیں، تو ان مزارعوں کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ دوسرے زمیندار کی ملکیت (۲۰۰) ایکڑ رقبہ ہے اور بیس مزارعہ۔ اس سے حاصل شدہ (دس ایکڑ) رقبہ ان بیس مزارعوں میں سے صرف ایک کو مل سکے گا۔ یہ ایک مزارعہ کون سا ہوگا؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ اور اسی گاؤں میں جن باقی مزارعوں کو کچھ نہیں ملے گا ان کی مایوسی کا کیا عالم ہوگا! ہمیں تو ڈر ہے کہ جن اصلاحات کے اعلان پر اس طرح جشن منایا گیا ہے، ان کی عملی تنفیذ پر ملک میں کہیں فسادات نہ شروع ہوجائیں۔ ہمارے ہاں تو کھیتوں کی حدوں اور کناروں پر قتل ہوجایا کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے فسادات کا سلسلہ ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ چنانچہ ۹ مارچ کے امروز (لاہور) میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ تقریباً دو سو ہاریوں نے جن میں کچھ بندوقوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے، حیدرآباد سے دس میل دور ٹنڈو جام کے نزدیک ایک شخص چوہدری اسلم کے زرعی فارم پر جبراً قبضہ کرلیا۔ ان کا کہنا ہے کہ صدر بھٹو کی زرعی اصلاحات کے اعلان کے بعد وہ اس فارم کے مالک قرار پاگئے ہیں۔ جب پولیس نے ان ہاریوں کو فارم سے باہر نکالنا چاہا تو دونوں پارٹیوں میں تصادم ہوگیا جس کے نتیجہ میں پولیس کو گولی چلانی پڑی۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے۔ اس کے لئے بڑے تدبر کی ضرورت ہے۔

زرعی اصلاحات کی رُو سے پورے مغربی پاکستان سے کس قدر ایسی اراضی حاصل ہوگی جسے کاشتکاروں میں تقسیم کیا جائے گا، اس کے اعداد و شمار تو ابھی سامنے نہیں آئے، البتہ پنجاب کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ کل دو لاکھ پچپن ہزار ایکڑ

زمین حاصل ہوگی۔ اس سے بارہ ایکڑ فی کاشتکار کے حساب سے قریب بیس ہزار کاشتکاروں کو زمین حاصل ہوسکے گی (نوائے وقت ۲ جون ۱۹۷۲ء) اس کے مقابلہ میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے کاشتکار ہوں گے جو اس امید میں بیٹھے ہیں کہ انہیں ۱۲/۱ ۱۲ ایکڑ اراضی بلاقیمت مل جائے گی لیکن جنہیں اب ایک مرلہ زمین بھی نہیں مل سکے گی۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اس فیصلہ کے بعد وہ کس قدر مایوس ہوں گے اور اس سے کتنے جھگڑے پیدا ہو جائیں گے۔ زرعی اصلاحات میں ویسے ہی بڑے اسقام ہیں اور جب سوال پیدا ہوگا زمینداروں سے زاید رقبات حاصل کرنے اور انہیں مزارعین میں تقسیم کرنے کا تو ان سے اس قدر پیچیدگیاں اور الجھنیں پیدا ہوں گی جن کا حل نہیں مل سکے گا اور کاشتکاروں میں اس قدر باہمی عداوت اور رقابت ابھر آئے گی جس سے عام فسادات پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔

~~~~~(۰)~~~~~

۳- طلباء کی ہنگامہ خیزیاں

اب آئیے اس میدان کی طرف جو اس عفریت کی سب سے زیادہ آتش خیز اور برق ریز رقص گاہ ہے اور جہاں کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب کوئی نہ کوئی شعلہ بھڑکتا دکھائی نہ دے۔ یہ ہے اس حرماں نصیب قوم اور سوختہ بخت ملک کے طالب علموں کا طبقہ! اس سے بڑھ کر کسی قوم کی بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ وہ نژاد نو جسے مستقبل کا معمار بننا تھا اسکے حاضر و موجود کی گورکن بن رہی ہے۔ وہ جس نے اس کی متاع علم و ہنر کی وارث قرار پانا تھا علم و ہنر کے ہر نشان تک کو مٹا دینے کے درپے ہے یہی وہ طبقہ تھا جسے تخریبی قوتوں نے اپنی یورشوں کا ہراول دستہ بنایا، اور جو آج ایک بے سری فوج کی طرح ہمہ تن تخریب بن رہا ہے۔ اس طبقہ کی تباہ کاری — نہیں بلکہ خودکشی — کی سرگرمیوں سے کون واقف نہیں۔ ہر درس گاہ ان کی شعلہ فشانیوں کی محیط اور ہر دانشکدہ ان کی سوختہ سامانیوں کا مرکز ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ان کی ہنگامہ خیزیوں کی داستانیں حساس قلوب کو خون کے آنسو نہ رلاتی ہوں۔ دو چار تازہ ترین واقعات ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) سندھی طلباء و طالبات نے ریڈیو پاکستان کی سندھی دشمن پالیسی کے خلاف ریڈیو پاکستان کراچی کے جشن طلباء میں ہونے والے سندھی مباحثہ کا بائیکاٹ کیا۔ اس موقعہ پر طلباء کی مختلف انجمنوں کی طرف سے مباحثہ بھی کیا گیا اور صوبائی وزیر مواصلات مسٹر عبدالوحید کو جو سندھی مباحثہ کی صدارت کرنے والے تھے، گھیر لیا۔ (جنگ کراچی ۲۰ جون ۷۲ء)

(۲) سکھر ۱۳ مئی۔ آج صبح خیرپور شہر میں طلباء کے ایک گروہ نے دہشت گردی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے "جئے سندھ اور سندھی بولی قومی بولی" کے نعرے لگائے۔ دکانداروں کو دھمکا کر دکانیں بند کرائیں۔ اسکولوں اور دیگر تعلیمی اداروں کو زبردستی بند کرایا اور بازار میں اردو میں لکھے ہوئے سائن بورڈ اتار کر پھینک دیئے۔ صوبے کے مختلف مقامات پر جن طلباء نے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے ان کے مطالبات کی حمایت میں یہ جلوس نکالا گیا تھا۔ (جنگ کراچی ۱۴ مئی ۱۹۷۲ء)

(۳) امروز ۷ جون ۱۹۷۲ء — کراچی یونیورسٹی کا جلسہ تقسیم اسناد طلباء کے ہنگامہ کی نذر ہو گیا۔ گورنر کو تقریر کے بغیر واپس جانا پڑا۔ ہنگامہ کی وجہ سے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اپنا سپاسنامہ بھی پیش نہ کر سکے۔ ہزاروں طلباء نے "اردو کو سندھ کی سرکاری زبان قرار دو" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ طلباء کے دو گروپوں کے درمیان ہاتھا پائی بھی ہوئی۔
~~~~~

(۴) مساوات۔ ۱۱ جون ۷۲ء۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور پر طلبار کا قبضہ آج چھٹے روز بھی جاری رہا۔ آج طلبار کے ایک وفد نے وزیر تعلیم سے ملاقات کی۔ اس وقت (علاوہ دیگر حضرات) کالج کے پرنسپل صاحب بھی موجود تھے، وزیر تعلیم نے ان سے کہا کہ اگر کالج کا عملہ اور طلبا ان پر اعتماد نہیں کرتے تو وہ اپنے عہدہ کے ساتھ چمٹے رہنے پر کیوں بضد ہیں۔ پرنسپل صاحب نے منگل تک سوچ کر اپنا فیصلہ دینے کا وعدہ کیا (اگر طلبار کے خلاف فیصلہ ہوا اور انہوں نے وزیر صاحب کے خلاف بھی عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر دیا تو کیا وزیر صاحب بھی اپنے عہدے سے چمٹے رہیں گے یا اُسے چھوڑ دینگے۔)

(۵) پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخاب کے موقعہ پر جو ہنگامے ہوئے تھے ان کی تفاصیل اخبارات میں آ چکی ہے۔ چاقو چلے۔ لاٹھیاں برسیں۔ گولیاں چلیں۔ ایک طالب علم کی جان ضائع ہوئی۔ متعدد زخمی ہوئے۔ ہنگامہ سرد پڑا تو فیصلہ ہوا کہ انتخاب دوبارہ کرائے جائیں۔ (یعنی پھر ہنگاموں کا بازار گرم ہو)۔ انتخابات دوبارہ ہوئے تو نوائے وقت کی ۱۱ جون کی اشاعت میں شہ سرخیوں کے ساتھ حسب ذیل خبر شائع ہوئی۔

> نیو کیمپس میں طلبار کے دو گروہوں کے درمیان تصادم کے بعد پنجاب یونیورسٹی اور ملحقہ کالج غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیئے گئے۔
>
> بائیں بازو کے طلبار نے دائیں بازو کے طلبار کو شدید زخمی کر دیا۔
>
> ریوالوروں۔ لاٹھیوں اور آہنی سلاخوں کا آزادانہ استعمال۔

(مساوات بابت ۱۱ جون میں یہ خبر یوں شائع ہوئی ہے "یونیورسٹی میں ترقی پسند طلبا پر جماعتی غنڈوں کی اندھا دھند فائرنگ۔ متعدد طالب علم شدید زخمی)

> یہ ہے صوبے کی سب سے بڑی واجب الاحترام تعلیم گاہ کا منظر!

(۰)

۴۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے؟

معاشرہ میں امن بحال رکھنے کے لئے، مجرموں کو جیلخانے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس خبر سے لگائیے جو روزنامہ امروز کی ۸ جون کی اشاعت میں ان الفاظ میں شائع ہوئی ہے:-

> "سنگین نوعیت کی مجرمانہ وارداتوں کا ارتکاب جیلوں میں نظر بند قیدی کرتے ہیں۔"

اس کے بعد تفصیل اس اجمال کی یوں دی گئی ہے کہ

> معلوم ہوا ہے کہ لاہور میں کار چوری اور سنگین نوعیت کی جو دوسری وارداتیں ہوتی ہیں ان میں اکثر کا ارتکاب قیدی اور وہ جرائم پیشہ افراد کرتے ہیں جو ان دنوں لاہور کی جیلوں میں ہیں۔ اس سنسنی خیز انکشاف کے بعد ایس ایس پی۔ لاہور نے، لاہور کی تمام جیلوں کے باہر رات کے وقت نگرانی شروع کرا دی ہے۔

اور اگر ان کے خلاف سخت قسم کے اقدامات کئے جائیں تو پھر کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق اس خبر کو پڑھیئے جو روزنامہ مشرق

کی ۵ جون کی اشاعت کے صفحۂ اوّل پر رنگین سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔ وھوھذا۔

سکھر جیل میں پولیس کی فائرنگ سے تیرہ قیدی ہلاک اور ۳۵ زخمی ہو گئے۔ قیدیوں اور محافظوں میں دست بدست لڑائی۔ ایس۔پی اور دو تھانیدار شدید زخمی ہو گئے۔

قیدی دیسی پستولوں اور آہنی سلاخوں سے مسلح تھے۔

(ملتان اور لاہور جیلوں کے ہنگاموں کی یاد ابھی ذہنوں میں تازہ ہے)

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

(۱)

۵۔ قتل۔ ڈاکہ۔ رہزنی۔ قزاقی۔ نقب زنی۔ اغوا

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ گرمیوں میں کبھی کبھی سرخ آندھی آیا کرتی تھی۔ جب وہ آندھی آتی تو مشہور ہو جاتا کہ کہیں کوئی قتل ہوا ہے جو بے گناہ کا خون آسمان پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ایسا کہیں سال دو سال میں ہوتا تھا۔ یعنی اس زمانے میں قتل کی وارداتیں اس طرح شاذ و نادر ہوتی تھیں کہ ان کی خبر معاشرہ میں سنسنی پیدا کر دیتی تھی۔ اب حالت یہ ہے کہ صبح اخبار کھولئے تو دو چار قتل کی وارداتیں کی خبریں سامنے آ جائیں گی۔ اور معاشرہ اب ان کا ایسا خوگر ہو چکا ہے کہ ہم ان خبروں کو پڑھ کر یوں بے حسی سے آگے بڑھ جاتے ہیں جیسے ٹمبکٹو کا کوئی واقعہ ہو۔ قتل کے علاوہ نقب زنی۔ ڈاکہ۔ رہزنی۔ قزاقی۔ اور اغوا کی وارداتیں بھی معاشرہ کا معمول بن چکی ہے۔ اس وقت معاشرہ میں کوئی امن پسند، شریف آدمی اپنے آپ کو محفوظ نہیں پاتا۔ ملک میں قانون کا احترام کہیں باقی نہیں رہا۔ اگر کچھ تھوڑا بہت ہے تو متوسط طبقہ میں جسے عرفِ عام میں سفید پوش طبقہ کہا جاتا ہے (یا کہا جاتا تھا کیونکہ اب تو وہ طبقہ بھی آہستہ آہستہ "سیاہ پوش" ہوتا جا رہا ہے)

قتل کی وارداتوں سے فسادات کی نئی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ اس وقت ملک میں سیاسی پارٹیوں کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ مقتول کوئی بھی ہو، اس کا تعلق کسی نہ کسی پارٹی سے ضرور ہو گا۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو کوئی نہ کوئی پارٹی اس کا اپنے ساتھ تعلق وابستہ کر لیتی ہے۔ اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ ادھر قتل ہوا اور ادھر ایک پارٹی نے مشہور کر دیا کہ اس قتل کے پیچھے بہت بڑی سازش پنہاں ہے۔ اس کی نوعیت سیاسی ہے۔ اس میں فلاں مخالف پارٹی کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے اس کا چرچا کیا اور ان کی پارٹی کے کسی سرپھرے نے اٹھ کر مخالف پارٹی کے کسی فرد پر گولی چلا دی۔ یہ وبا بھی ملک میں عام ہو رہی ہے۔

ادھر یہ کچھ ہو رہا ہے اور ادھر اربابِ نظم و نسق نے ایک نہایت ابلہ فریب عذر تراش کر رکھا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے ایک لطیفہ سنئے۔ کسی گاؤں میں چوری کی واردات ہو گئی۔ پولیس بھی آ گئی اور گاؤں کے چودھری بھی جمع ہو گئے۔ لیکن چور نے کچھ ایسی چابکدستی سے واردات کی تھی کہ ہزار عقل دوڑانے پر بھی مجرم کا یقین نہ ہو سکا۔ ہر ایک اپنی اپنی رائے پیش کرتا لیکن بات آگے نہ بڑھتی۔ دور کونے میں ایک بوڑھا بیٹھا ان سب کی باتیں سن رہا تھا۔ جب وہ یہ کچھ سنتے سنتے تنگ آ گیا تو اس نے کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ ایسی آسان بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں بتاتا ہوں کہ کس کی کارستانی ہے۔ ہر ایک کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ پولیس افسر نے بھی کان کھڑے کئے۔ بوڑھے نے حقے کا کش لگایا اور کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام کسی چور کا ہے۔

یہی کیفیت ہمارے اربابِ نظم و نسق کی ہے۔ کہیں کوئی ہنگامہ ہو ان کی طرف سے فوراً آواز آجائے گی کہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا کون کر رہا ہے اور کون کرا رہا ہے۔ یہ سماج دشمن عناصر کا کام ہے جس کی پشت پر پاکستان دشمن بیرونی طاقتیں ہیں۔ یہ کہہ کر انہیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہم نے مفسدین کی نشاندہی کر کے اپنا فریضہ ادا کر دیا ہے۔ ہمارے سامنے پچیس سال سے یہی کچھ ہو رہا ہے لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ وہ سماج دشمن عناصر کون سے ہیں اور وہ بیرونی طاقتیں کون سی جو ان کی پشت پناہ ہیں۔ اور نہ ہی کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ فلاں فلاں سماج دشمن عناصر ہیں جو اس قسم کے ہنگامے برپا کرتے ہیں اور فلاں فلاں خارجی طاقتیں یہ کچھ کرا رہی ہیں تو آپ اس کا کوئی علاج کیوں نہیں کرتے ؟ اربابِ حکومت اس باب میں کسی قسم کی قیاس آرائی سے کام نہیں لیتے، وہ پورے حتم و یقین سے کہتے ہیں کہ انہیں علم ہے کہ ایسا کون کر رہا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں سندھ کے چیف منسٹر محترم ممتاز علی بھٹو نے کہا تھا کہ

> حکومت کے پاس اس کا ثبوت موجود ہے کہ جو لوگ ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے ذریعے ملک کو مزید ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشیں کر رہے اور سکیمیں بنا رہے ہیں، انہیں بیرونی طاقتوں کی طرف سے پیسہ ملتا ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۲۸ مئی)

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ:-

> ملک کو تباہ کرنے کی ان سازشوں کو ناکام بنا دیا جائے گا۔

ان کی خدمت میں کون یہ عرض کرے کہ صاحب!

> پس ازاں کہ من نہ مانم، بچہ کار خواہی آمد !

کیا آپ ان سازشوں کو اس وقت ناکام بنائیں گے جب (خدانخواستہ) ملک ختم ہو جائے گا !

(۲)

پرویز صاحب نے اکتوبر ۷۵ء میں کہا تھا کہ ان پارٹیوں نے جو جن اپنے مخالفین کے لئے بوتل سے باہر نکالے ہیں، جب وہ اُن (مخالفین) سے نمٹ لیں گے تو خود ان پارٹیوں کا رُخ کر لیں گے۔ اس وقت یہ پارٹیاں حکومت سے کہیں گی کہ ان جنات کا کچھ بندوبست کرو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اب اُن پارٹیوں میں سے خود ایک پارٹی (پیپلز پارٹی) برسرِ اقتدار آگئی ہے اور اسے ان کے آزاد کردہ جن نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اب یہ اس کے ہاتھوں کس قدر تنگ (عاجز آچکے) ہو چکے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ گذشتہ مئی میں جب صدر بھٹو محترمہ شہزادی اشرف پہلوی کے استقبال کے لئے کوئٹہ تشریف لے گئے تو وہاں اس جن نے بہیمانہ رقص شروع کر دیا۔ صدر بھٹو کا پروگرام یہ تھا کہ ایک جلسہ عام میں شہزادی موصوفہ کا استقبال کیا جائے اور مخالفین کی سکیم یہ کہ اس جلسہ کو ناکام بنا دیا جائے۔ اس پر صدر بھٹو نے تنگ آکر جو کچھ کہا وہ اربابِ فکر و بصیرت کے لئے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ انہوں نے کہا :

> میں اور میری حکومت اس بات کا پختہ عزم رکھتی ہے کہ سہ پہر کو کوئٹہ میں جو جلسہ عام منعقد کیا جائے گا میں تن تنہا اس جلسہ کا انتظام کروں گا۔ اس [illegible] کا مقصد یہ ہے کہ [illegible] منعقد ہونے سے پہلے میں یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ [illegible] لگا دوں گا۔ اگر جلسہ کامیاب ہوا تو ہم سب کو اس کی خوشی ہو گی۔ اور اگر یہ جلسہ ناکام ہوا تو میں

اسلام آباد واپس جانے کے بجائے لاڑکانہ چلا جاؤں گا۔ (نوائے وقت - ۲۱ مئی ۱۹۷۲ء)

آپ خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ کس قدر ہجوم کرب و بلا میں گھرے ہوئے قلبِ مضطر کی فغانِ درد انگیز ہے اور اس سے کس قدر مایوسی ٹپک رہی ہے۔ اقبال نے شاید کسی ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا تھا کہ

تھی وہ اک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں کہا تھا کہ شیطان اور ابلیس درحقیقت ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ شیطنت کے معنی سرکشی ہیں اور ابلیسیت کے معنی یاس و ناامیدی۔ "الہ دین کی بوتل کے جنوں" کی فکر کوبی کا آغاز شیطنت (سرکشی) ہوتا ہے اور انجام ابلیسیت (مایوسی)۔ آپ نے دیکھا کہ وہی سرکشی اور فساد انگیزی جس پر کبھی جشنِ مسرت منائے جاتے تھے اب کیسے یاس انگیز نتائج پیدا کر رہی ہے! اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب خود صدر بھٹو کو محسوس ہو رہا ہے کہ مزدوروں اور محنت کشوں کو جس لاقانونیت کا خوگر بنایا گیا تھا، وہ قوم کے لئے نقصانِ عظیم کا موجب ثابت ہوئی ہے اور اسے ختم کرنا اشد ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے کراچی میں مخلوط اقتصادی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

میں محنت کشوں اور مزدوروں سے اپیل کروں گا کہ وہ تشدد اور "گھیراؤ جلاؤ" کے طریق سے باز آجائیں کیونکہ یہ طریق کار ملک کی معیشت کے لئے بھی مضرت رساں ہے اور خود مزدوروں کیلئے بھی۔ (پاکستان ٹائمز - ۲۴ مئی)

صدر بھٹو کو اس تخریبی طریق کار کے نقصانات کا کس شدت سے احساس ہے، اس کا اندازہ ان کے اس تفصیلی بیان سے لگ سکتا ہے جسے انہوں نے اپنے حالیہ دورہ سے واپسی پر شائع کیا ہے۔ اس میں انہوں نے کہا کہ

ہر شخص جانتا ہے کہ اگر ملک میں صنعت زوال پذیر ہو گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ (اشیائے صرف کی) قیمتیں بہت چڑھ جائیں گی۔ بے کاری بڑھ جائے گی۔ بے امنی اور بے اطمینانی شدت اختیار کر جائے گی۔ ملک میں انتشار اور خلفشار پیدا ہو جائے گا۔ آپ سوچئے کہ اگر کسی ملک میں اس قسم کے حالات پیدا ہو جائیں تو اس کی معیشت کا بحال ہونا تو ایک طرف، وہ ملک زندہ بھی رہ سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے آپ براہ کرم اپنے دلوں کو ٹٹولئے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۱ مئی)

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ملک میں "انقلاب" لانے کا جو طریقہ پیپلز پارٹی نے اختیار کیا تھا، اس کے تخریبی مضرت رساں نتائج کا مسٹر بھٹو کو خود ہی احساس ہو گیا۔ آپ طلوعِ اسلام کے اوراق الٹیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم مسلسل اور متواتر کہتے چلے آ رہے ہیں کہ تشدد کے ذریعے فساد برپا ہوتا ہے، انقلاب نہیں لایا جاتا۔ انقلاب، قلب و دماغ میں صحیح نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے سے آتا ہے۔ تشدد کی جڑ میں خرابی ہوتی ہے۔ قانون شکنی کی اصل زہر آلود ہوتی ہے۔ فساد بہرحال فساد ہے خواہ وہ کسی کے خلاف بھی کیوں نہ برپا کیا جائے۔ یہ نظریہ قطعاً غلط ہے کہ جب ہم فریقِ مخالف کے خلاف فساد برپا کریں تو وہ مستحسن ہوتا ہے اور جب کوئی دوسرا ہمارے خلاف فساد برپا کرے یا کرائے تو وہ درخورِ مذمت ہوتا ہے اور اس قابل کہ اسے کچل دیا جائے۔ قرآن کریم نے جب فساد کو باعثِ تخریبِ انسانیت قرار دیا تھا تو اس نے یہ کچھ "نفسِ فساد" کے متعلق کہا تھا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ جب تم دوسروں کے خلاف فساد برپا کرو

تو۔ تمہارا یہ عمل درخورِ تحسین ہوگا اور جب دوسرا تمہارے خلاف فساد برپا کرے تو وہ سزاوارِ تعزیر ہوگا۔ فساد بہرحال فساد ہے اور ہر نوع قابلِ مذمت۔

اس دو تین برس میں ملک میں لاقانونیت کی جو روش عام ہوگئی ہے، اسے روکنے کا یہ طریقہ نہیں کہ لوگوں سے اس قسم کی اپیلیں کی جائیں۔ اس کے لئے مثبت اور منفی دونوں طریق کار اختیار کرنے ضروری ہیں۔ مثبت یہ کہ نہایت دیانتداری سے اس کا اعتراف اور اعلان کیا جائے کہ انقلاب لانے کے لئے ہم نے جس تشدد آمیز طریق کی تلقین کی تھی وہ غلط تھا، اور ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہے۔ اس اعتراف کو ہر ممکن ذریعۂ ابلاغ کی مدد سے ملک کے گوشے گوشے میں عام کیا جائے۔ اخبارات میں اس کی مذمت کی جائے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر اس کی مخالفت کی جائے۔ ہر ممکن طریق سے اس کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اس کے خلاف تعلیم و تلقین عام کی جائے۔ غرضیکہ جس شدت سے ان دو تین سالوں میں اس خیال کو عام کیا گیا ہے، اسی بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے اس کی مخالفت اور مذمت کی جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ لاقانونیت کے جن کو پیپلز پارٹی ہی نے بوتل سے نہیں نکالا تھا اس میں اُس وقت (۱۹۶۸-۶۹ء) کی کم و بیش تمام سیاسی پارٹیاں شامل تھیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اسے بوتل میں دوبارہ بند کرنے کی ذمہ داری اب سب سے زیادہ صدر بھٹو پر عاید ہوتی ہے اس لئے کہ صدرِ مملکت ہونے کی جہت سے وہی اس کے اولین محافظ اور پاسبان ہیں۔ اب جب انہیں اس کا اعتراف ہے کہ یہ طریقِ کار شدید نقصان رساں ہے تو ہمیں امید ہے کہ جس طرح انہوں نے ابھی اگلے دنوں نہایت جرأت اور جسارت سے اس حقیقت کا اعلان کیا تھا کہ وہ مارکسزم سے صرف اقتصادی پروگرام سے استفادہ چاہتے ہیں۔ اس کا فلسفۂ حیات ان کے نزدیک یکسر مردود و مطعون ہے کیونکہ وہ اسلام کے فلسفۂ زندگی کے خلاف ہے، اسی طرح وہ اب بھی مزید ہمت اور بسالت سے کام لے کر اس کا بھی اعلان کر دیں گے کہ تشدد کا طریقِ کار قابلِ مذمت ہے۔ ہم اس سے خود بھی اجتناب کریں گے اور دوسروں کو بھی اس سے مجتنب رہنے کی تلقین اور تاکید کریں گے۔ اس سے یہ ملک مزید خطرات سے بچ جائے گا۔

اس اعلان کے بعد وہ ہر قسم کی لاقانونیت کو سختی سے روکیں اور اس میں کسی قسم کی رُو رعایت سے کام نہ لیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کے حالات جس حد تک بگڑ چکے ہیں انہیں سنوارنے کے لئے وقت درکار ہوگا۔ لیکن اگر اس پروگرام پر دیانت و امانت سے عمل پیرا ہوا جائے تو ہمیں امید ہے کہ جو تخریب اس وقت عام ہو رہی ہے وہ جلدی رُک جائے گی۔ اور اس کے بعد اصلاح و تعمیر کے اقدامات میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ لاقانونیت کو قابلِ فخر اور ہنگامہ آرائی کو موجبِ اعزاز سمجھنے سے قوم کی ذہنیت بگڑ چکی ہے۔ اس کی اصلاح ذہنیت کے بدلنے سے ہو سکے گی۔ اس کے بعد وہ افراد باقی رہ جائیں گے جو اپنی ذہنیت بدلنا نہیں چاہیں گے۔ تو انہیں تعزیرات کی زنجیروں میں جکڑنا ہوگا۔

یوں یہ "الٰہ دین کا جن" دوبارہ بوتل میں بند ہو سکے گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ ملک بیرونی خطرات سے تو شاید محفوظ رہ جائے اس جن کی داخلی تباہ کاریوں کے ہاتھوں یقیناً تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ہم وزیر صاحب کے خطاب کے اس عنوان کو نہ صرف یاد رکھئے بلکہ اٹھتے بیٹھتے دہراتے رہیئے کہ

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے۔ ہنگاموں سے نہیں۔

(تحریر۔ ۱۳ جون ۷۲ء)

(پ)

ابلیس و آدم

پرویز صاحب کی اس یگانہ روزگار تصنیف کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا اور جلدی ختم ہو گیا تھا۔ اسکے بعد انکی تازہ تصنیفات کا سلسلہ کچھ اس طرح علی التواتر جاری رہا کہ سابقہ کتابوں کے جدید ایڈیشنوں کی باری نہ آسکی، حالانکہ تشنگانِ شوق کی طرف سے انکے تقاضے برابر موصول ہوتے رہے۔ للہ الحمد کہ اب ان تصانیف کے تازہ ایڈیشن چھپنے شروع ہو گئے ہیں چنانچہ سب سے پہلے ان کی معرکہ آرا کتاب

ابلیس و آدم

باندازِ نو سامنے آرہی ہے کیونکہ مصنف نے بیس سال کے بعد نظرِ ثانی سے اس میں بہت سی تبدیلیاں کی ہیں — کتاب کے موضوعات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے یعنی

(۱) "پہلا انسان" کیسے پیدا ہوا؟　(۲) قصہ آدم کا مفہوم کیا ہے؟

(۳) ابلیس کون ہے؟　(۴) شیطان کسے کہتے ہیں؟

(۵) جنات سے کیا مراد ہے؟　(۶) ملائکہ کی حقیقت کیا ہے؟

(۷) وحی کیا ہوتی ہے؟　(۸) رسالت کا انقلابی مشن کیا تھا؟

ایسے اہم عنوانات سے متعلق پرویز صاحب کی قرآنی فکر اور حسین قلم کا امتزاج — کتاب دبیز سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ بڑی تقطیع۔ ضخامت قریب ۴۰۰ صفحات۔ مضبوط جلد۔ دیدہ زیب گرد پوش۔

قیمت:- (علاوہ محصول ڈاک) ۱۵ روپے

(ملنے کا پتہ)

ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ بی گلبرگ۲ - لاہور　　مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

محمد اسلام (نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی)

مسئلہ تعلیم اور طلوعِ اسلام

(داستانِ جہادِ مسلسل)

(طلوع اسلام کنونشن ۱۹۷۵ء میں پڑھا گیا)

صدرِ گرامی قدر و عزیزانِ محترم!

طلوع اسلام کی حالیہ کنونشن کے پروگرام میں ایک نشست کو مسئلہ تعلیم کے لئے مخصوص دیکھ کر ایک صاحب نے فرمایا۔ غنیمت ہے کہ طلوع اسلام کو قوم کے اس بنیادی مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہوا ۔۔۔ یہ صاحب طلوع اسلام کی داستانِ حیات سے واقف نہیں تھے اس لئے انہوں نے ایسا خیال کیا۔ اگر وہ اس سے واقف ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ طلوع اسلام کی ساری زندگی اسی احساس کی ترجمانی ہوتی تفسیر ہے۔ اس سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ ہوسکتا ہے کہ ان کی طرح اور احباب بھی ایسے ہوں جو طلوع اسلام کی تگ و تاز کے اس گوشے سے ناواقف ہوں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کنونشن میں اس گوشے کو بھی ذرا تفصیل کے ساتھ سامنے لایا جائے اور بتایا جائے کہ اس کی زندگی کا کوئی سانس ایسا نہیں گزرا جس میں اس نے اس بنیادی مسئلہ کی اہمیت کو اجاگر نہ کیا ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہنے کی بھی جرأت کرونگا کہ پاکستان میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جس نے تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کو اس تسلسل و تواتر اور شد و مد سے قوم کے سامنے پیش کیا ہو۔ میں طلوع اسلام کے اس جہادِ مسلسل کی داستان کو خود مرتب کرنا چاہتا تھا لیکن میرے سامنے مجلہ طلوع اسلام کی ستمبر ۱۹۶۰ء کی اشاعت کے لمعات آگئے جن میں اس نے خود اس داستان کی مختلف کڑیاں مرتب طور پر پیش کی ہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسی کی بیان کردہ داستان کو سامعین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

طلوع اسلام کی زندگی کا پاکستانی دور ۱۹۴۸ء سے شروع ہوتا ہے اس اعتبار سے اس داستان میں (جو ۱۹۶۰ء میں پیش کی گئی تھی) اس مسئلہ کے متعلق اس کی تگ و تاز کے پہلے بارہ سال کی سرگذشت سمٹ کر آگئی ہے۔ غور سے سنئے کہ اس باب میں طلوع اسلام میں کیا کہا گیا تھا۔

(۱) اس دفعہ جوں جوں برسات کا موسم گزرتا جا رہا ہے لوگوں کو اطمینان کا سانس آرہا ہے کہ امسال ملک اس سیلاب سے محفوظ رہیگا جو گذشتہ کئی برسوں سے عالمگیر تباہی کا موجب بنتا چلا آرہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کا دریاؤں کے سیلاب سے محفوظ رہنا موجب ہزار خیر و برکت ہے لیکن جن لوگوں کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی عطا ہوئی ہے، ان کی نگاہیں ایک اور سیلاب کو دیکھ رہی ہیں جو ملک کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے (اور جس کی تباہ کاریاں دریاؤں کے سیلاب

سے کہیں زیادہ شدید اور وسیع ہیں — دریاؤں کا سیلاب زمین کی سطح پر آتا ہے لیکن یہ دوسرا سیلاب زندگی کی گہرائیوں تک میں اتر جاتا ہے۔ دریاؤں کا سیلاب بارش کے پانی سے امنڈ آتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب کے چشمے انسانی قلوب سے ابھرتے ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب موجودہ آبادی کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے، لیکن اس دوسرے سیلاب کی تلاطم خیزیاں آنے والی نسلوں تک کو محیط ہوتی ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب زمین کی فصلوں کو بہا کر لے جاتا ہے لیکن یہ دوسرا سیلاب دل کی کھیتیوں کو ویران کر دیتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب سے ایسی وبائیں پھوٹتی ہیں جن سے انسانوں کا جسم ہلاک ہوتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب سے پیدا شدہ جراثیم سے قوم کی روح میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب کا اثر ایک آدھ موسم تک رہتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب کا اثر نسلوں تک مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب میں افراد ڈوبتے ہیں اس دوسرے سیلاب میں قوم کی قوم ڈوب کر تباہ ہو جاتی ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ یہ دوسرا سیلاب کونسا ہے جس کی تباہ کاریاں اس قدر شدید، وسیع اور گہری ہیں؟ یہ سیلاب ہے قوم کے نوجوانوں کی آوارگی، جس کی لپیٹ میں اس وقت ہمارا ملک بُری طرح آچکا ہے۔ چاروں طرف سے چیخ و پکار ہو رہی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کا اخلاق تباہ ہو چکا ہے۔ ان کی حرکات آوارگی کی حد سے آگے بڑھ کر جرائم پیشگی تک پہنچ چکی ہیں۔ ان کے ہاتھوں شریف انسانوں کا جینا حرام ہو رہا ہے۔ شریف زادیاں ان کے ڈر سے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ خود ان کے ماں باپ ان کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ معاشرہ ان کی حرکات سے لرزاں و ترساں ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سیلاب بلا کا علاج کیا کیا جائے۔؟

اس میں شبہ نہیں کہ (بدقسمتی) سے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بیشتر طبقہ اسی آوارگی کا مظہر ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن یہ آوارگی ایک دن کی پیدا کردہ نہیں۔ یہ آگ مدتوں سے سلگ رہی تھی، اب بھڑک اٹھی ہے اس کے خلاف قوم کے اربابِ حل و عقد اور اصحابِ فکر و نظر کا احتجاج بھی حق بجانب ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان نوجوانوں کی اس آوارگی، قلب و نگاہ کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر آپ بنظرِ عمیق دیکھیں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس فسادِ قلب و نظر کی ساری ذمہ داری انہی بڑے بوڑھوں کے سر عاید ہوتی ہے جو اس کے خلاف اس شدت سے واویلا کر رہے ہیں۔ قوم کے بچے گیلی کوزہ گراں (کمہار کی مٹی) ہوتی ہے جسے جس شکل میں چاہے منتشکل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ خام مواد (RAW MATERIAL) ہوتا ہے جس سے آپ جو جی میں آئے بنا لیں۔ یہ وہ پگھلنے والی دھات ہے جسے جس قالب میں چاہے ڈھالا جا سکتا ہے۔ ہمارے نوجوان جو کچھ بن کر سامنے آرہے ہیں، یہ از خود ایسے نہیں بن گئے، یہ ہمارے بنائے ہوئے ایسے بنے ہیں۔ ان کی اس آوارگی کے ذمہ دار ہم خود ہیں جنہوں نے نہ ان کی صحیح تعلیم کا کوئی بندوبست کیا، نہ تربیت کا۔ یہ وہ خطرہ تھا جسے ہم نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد محسوس کیا تھا اور قوم کے ذمہ دار حضرات سے کہا تھا کہ سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں۔ آپ جون ۱۹۴۹ء کے لمعات سامنے لائیے ہم نے قوم کے "ذہنی انتشار اور فکری آوارگی" کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد لکھا تھا۔

درد قومی کی تعمیر کے دو گوشے ہوتے ہیں۔ ایک موجودہ نسل کی صلاحیتوں کی بیداری اور دوسرے آنے والی نسل کی صحیح تربیت۔ ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کی موجودہ نسل میں ارتفاع و ارتقار کی صلاحیتیں ہی باقی نہ رہی ہوں۔ اس صورت

میں اربابِ فکر و نظر کی پوری توجہات آنے والی نسل پر مرکوز ہو جاتی ہیں، تاکہ یہ ابھرنے والے بچے بیکارِ آب و گل کے بجائے زندگی کے جیتے جاگتے مجسمے بن کر سامنے آئیں۔ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کو فرعون کے دستِ استبداد سے نجات دلائی ہے تو اُن کے سامنے یہی مقصدِ جلیل تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ فرعون کی انسانیت کُش حکمتِ عملی نے کس طرح نہ صرف بنی اسرائیل کی نسلِ حاضر کو زندگی کی لذتوں سے بے گانہ بنا رکھا ہے بلکہ وہ ان کی آنے والی نسلوں کو بھی کس بُری طرح سے ذبح کئے جا رہا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو محکومی کے چنگل سے نکالا تو اپنی تمام سعی و کاوش آنے والی نسل کی تربیت کے لئے وقف کر دی۔ نتیجہ یہ کہ جب وہ "شاہین بچے" جوان ہوئے تو انہوں نے نظامِ کہن کی ہر فرسودہ بساطِ کہن کو الٹ کر رکھ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ محکومی اور آزادی میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ آزادی میں ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اپنے تصورات کے مطابق کر سکتے ہیں اور یہ چیز محکومی میں ممکن نہیں ہوتی۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اِس دو سال کے عرصۂ آزادی میں ہم نے اپنے بچوں کی تعلیم میں کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں جس سے ان کا دل و دماغ ان سانچوں میں ڈھل جائے جو ہمارے تصورِ حیات کا آئینہ ہیں (واضح رہے کہ طلوعِ اسلام نے یہ لمعات ۱۹۴۸ء میں لکھے تھے اس لئے کہا گیا ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے اس دو سال کے عرصہ میں اس باب میں کیا کیا ہے)۔ جہاں تک ہم دیکھ رہے ہیں اس سوال کا جواب نہایت مایوس کُن ہے۔ ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کوتاہی کے لئے کوئی بھی وجہ جواز ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو کارخانے کھولنے کے لئے مشینوں کی ضرورت ہے جو ممالکِ غیر سے منگانی پڑیں گی۔ اس لئے یہ احتیاج ہماری صنعت و حرفت کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے ہمیں اسلحہ و آلاتِ عسکریت کے لئے بھی بیرونی امداد کی احتیاج ہے اس لئے ہم اس باب میں بھی معذور ہیں۔ ہمیں فنی (TECH-NICAL) شعبوں میں ٹریننگ کے لئے ماہرینِ فنون کی ضرورت ہے جن کی ہمارے ملک میں سر دست کمی ہے۔ اس لئے ہم اس باب میں معذور ہیں۔ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کی راہ میں اپنے بچوں کے لئے جدید نصابِ تعلیم تیار اور نافذ کرنے کے لئے کونسا سنگِ گراں حائل ہے جس کے لئے آپ

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں؟

یہ کہا گیا تھا ۱۹۴۸ء میں۔ اس کے ایک سال بعد طلوعِ اسلام نے اسی حقیقت کو اور وضاحت سے بیان کیا تھا جب لکھا تھا کہ:

ہمارے نزدیک اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی ——
بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی جو آج ہماری ہے۔ مدتوں کی غلامی نے ان کے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے اور افسردگی اور دنائت کی تمام خرابیاں اُن میں پیدا ہو چکی تھیں۔ صاحبِ ضربِ کلیم کے یدِ بیضا کی چمک انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطۂ زمین میں لے آئی تھی۔ لیکن خطۂ زمین کے مل جانے سے اُن کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ایک چھوڑ تین پیغمبر ان کے اندر موجود رہتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ جاہل تھے وہی رہے۔ چنانچہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور صرف اتنا انتظام کر لو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث نہ بن جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ ان کی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مرورِ زمانہ سے یہ بوسیدہ ہڈیاں رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئیں اور سامنے میں وہ نوجوان تیار ہو گئے جنہیں خاص انداز سے پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ شاہین بچے ابھرے اور ایک ہی جھپٹ میں اس ارضِ موعود پر قابض ہو گئے

جس میں اُن کے بڑے بوڑھوں کو بڑے بڑے دیو نظر آیا کرتے تھے۔ لہٰذا پاکستان والوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ رویئے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے۔ نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رُو سے کس قدر خام ہے۔ رویئے اس پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم و نسق کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جا سکتا ہے لیکن آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی آئی تو پھر یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود بھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہم لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہی۔ لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں اسکول نہیں کھولے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ یہ نہیں۔ آپ قریہ قریہ میں بھی اسکول کھول دیجئے اور ہر اسکول کا نتیجہ سو فیصد دکھا دیجئے، تو بھی ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہونگی اُسی قسم کی اُس کی زندگی ہوگی۔ اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اُسی قدر سعی و کاوش اور جذب و انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرمِ عمل رہیگا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے۔ جس قسم کی تعلیم ہوگی اُسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (کہ وہ انہیں نظامِ زندگی اور حکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے) تو اس سے مراد نوشت و خواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی بالیدگی (ڈیویلپمنٹ) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں اُنکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم بھیڑیوں کا گروہ یا حیوانوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لاتا ہے اور یہی اقدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں۔ چونکہ قرآن وہ اقدار متعین کرتا ہے جس سے انسانیت کی پوری پوری نشو و نما ہوتی ہے اس لئے جس کسی کی سیرت ان اقدار کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ ظاہر ہے کہ رقبہ اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بہت سے خطوں سے پیچھے ہے اور جس رفتار سے دنیا ترقی کر رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہم مغربی اقوام کے ہم پلہ کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بلکہ اس سے آگے نکل جانے کے لئے ہمارے پاس ایک دوسرا میدان ہے اور وہ میدان ہے اُن اقدار کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اقدار کسی اور فلسفۂ زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جو کیرکٹر ان اقدار کے قالب میں ڈھلے گا، اُس کی قوت کا جواب دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکیگا۔ یہ ہے وہ میدان جس میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی موجودہ خامیوں ہی کو دور کر سکیں گے بلکہ ہم مغرب کی ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔" (یہ لکھا گیا تھا طلوعِ اسلام کی

اشاعت بابت اگست ۱۹۵۱ء میں۔ اس کے بعد طلوعِ اسلام اپنی اس پکار کو برابر دہراتا رہا، لیکن قوم کو نہ سننا تھا نہ سُنا۔ اس کے بعد اُس نے دسمبر ۱۹۵۵ء میں ملک کے عام حالات کا جائزہ لینے کے بعد لکھا تھا۔

"لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآنی نظام اپنی حقیقی رُوح کے مطابق اُسی صورت میں نافذ اور نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے تقاضے دل کی گہرائیوں سے ابھریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے ہمارے نوجوانوں کا قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائے تاکہ وہ قرآنی نظام کی محکمیت اور اصلیت کے علیٰ وجہ البصیرت قائل ہوں اور اس کی رُو سے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اسی سے ہماری سیرت میں بلندی اور کردار میں پختگی پیدا ہوگی۔"

اس کے بعد اُس نے قوم کی اخلاقی حالت کا ایک منظر پیش کرتے ہوئے کہا،

"قوم کے ہنگامی مفاسد کی روک تھام تو ہنگامی احکام و تدابیر سے ہو سکتی ہے، ان کا مستقل علاج اُسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان کی آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو۔ لہٰذا ہمارے جدید آئین میں اس امر کی بھی صراحت ہونی چاہیئے کہ قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی پوری پوری ذمہ داری مملکت پر ہوگی اور اس کے بنیادی خط و خال وہ ہوں گے جنہیں قرآن نے تجویز کیا ہے۔"

اس سلسلہ میں سب سے اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جس چیز کو ہم نے "صحیح تعلیم" کہا ہے اس سے مقصود کیا ہے؟ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب صدرِ مملکت نے پاکستان میں تعلیمی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا تو طلوعِ اسلام نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ہماری تعلیم کس قسم کی ہونی چاہیئے لکھا تھا،

"اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہماری تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اُس زندگی کا تصور جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے صاف اور واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے اور اس کی صداقت و محکمیت کا یقین دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہجِ زندگی اور فلسفۂ حیات اُس کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اسی کو اسلام یا الدّین کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس کے لئے واضح طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام (یا الدّین) کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کا مقصود و مطلوب کیا ہے؟ وہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان انسانوں کا نصب العین کیا ہوگا؟ اور ان کی سیرت و کردار کس قسم کا — یہ انسان کس قسم کا معاشرہ قائم کریں گے؟ اُس معاشرہ کے نتائج خود اپنی مملکت کے لئے کیا ہوں گے؟ اور باقی عالمِ انسانیت کے لئے کیا (وغیرہ وغیرہ) اسی کا نام "اسلامی تعلیم" ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم نہ تو وہ ہوگی جو اس وقت "اسلامیات" کے نام سے ہمارے سکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور نہ ہی وہ جس کا ماحصل ہمارے "علماء" ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں جو کچھ دینیات کے نام سے پڑھایا جاتا ہے اس سے بچوں کے ذہن میں دین کے متعلق چند رسومات اور توہم پرستیوں کے سوا اور کوئی تصور مرتسم نہیں ہوتا۔ باقی رہے ہمارے کالج (بلکہ یونیورسٹیاں) سو ان میں اسلامی تعلیم کا نہج و اسلوب وہی ہے جسے کبھی مغربی مستشرقین نے متعین کیا تھا۔ اس سے (غلط یا صحیح) کچھ معلومات تو ہم پہنچ جاتی ہیں، دین کی رُوح اور اس کی غرض و غایت کبھی سامنے نہیں آتی۔

اب رہے ہمارے مذہبی مدارس — سو وہاں کے فارغ التحصیل علماء حضرات کو اسلام کے متعلق کتنی واقفیت ہوتی ہے اس کا کچھ اندازہ آپ نے "منیر کمیٹی" کی تحقیقات کے دوران لگا لیا تھا جب متعدد علماء سے پوچھا گیا تھا کہ

"مسلمان کسے کہتے ہیں" تو ان میں سے بعض نے تو کہہ دیا کہ اس کا جواب فی الفور نہیں دیا جا سکتا۔ اور جنہوں نے جواب دیا تھا وہ اس کمیٹی کی رپورٹ کے اندر آج بھی موجود ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ اس سلسلہ میں اگر مزید تجربہ کرنا ہو تو ان حضرات کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیج کر کیا جا سکتا ہے کہ "اسلام کسے کہتے ہیں" اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ جوابات خود بتا دیں گے کہ ہمارے ان مکاتب اور دار العلوموں میں اسلام کے متعلق کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان مدارس کی غایت یہ ہے کہ طالب علموں کو فقہ کے کچھ مسائل بتا دیئے جائیں (وہ بھی بالخصوص ایسے جن کا تعلق شخصی قوانین PERSONAL-LAWS) سے ہو) اور کچھ کتابیں وعظ و نصیحت کی پڑھا دی جائیں تاکہ وہ امامت کے فرائض ادا کر سکنے کے قابل ہو جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ امامت کے فرائض سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ یا نمازِ جنازہ پڑھا دی جائے، جمعہ یا عیدین کا خطبہ دے دیا جائے یا نکاح پڑھا دیا جائے۔ جو علماء اس سے بلند درجہ پر ہوں وہ نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق فتویٰ دے سکیں یا (جو تقریر کرنا جانتے ہوں وہ) دوسرے فرقہ کے علماء سے مناظرہ کر سکیں۔ باقی رہا "نفسِ اسلام" تو وہ (مروجہ تعلیم کی رو سے) ان حضرات کے سامنے آ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے) حقیقی اسلام پر غیر اسلامی تصورات و نظریات، معتقدات و خیالات کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ ان کی موجودگی میں حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ نہیں سکتی۔ اور ان پردوں کو الگ کر دینا ان حضرات کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے انہی پردوں کو اصل اسلام سمجھ رکھا ہے۔ یہ بعینہٖ وہ حالات تھے جن سے تنگ آ کر یورپ نے مذہب کو کلیسا کی چاردیواری تک محدود کر دیا اور دنیا کے معاملات اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حل کرنے لگ گئے۔ جہاں تک مسئلہ زیرِ نظر (یعنی تعلیم) کا تعلق ہے، یہی حالت ہمارے ہاں بھی ہے۔ یہاں "دینی تعلیم" مذہبی مکاتب میں دی جاتی ہے اور "دنیاوی تعلیم" اسکولوں اور کالجوں میں۔ اس باب میں ہم میں اور اہلِ مغرب میں فرق یہ ہے کہ اس عملی ثنویت (DUALISM) کے باوجود ہم ہر منبر اور اسٹیج سے پکارتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، روح اور مادہ، دین اور دنیا میں کوئی مغایرت نہیں۔ اس قسم کی ثنویت یکسر غیر اسلامی ہے۔

لہٰذا ہمارے ہاں تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا یہ ہے کہ "مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی اس ثنویت کو ختم کر دیا جائے۔ جب ہمارے ہاں دین اور دنیا میں کوئی فرق نہیں تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درسگاہوں میں کیوں دی جاتی ہے؟ ہمارے ہاں عصرِ حاضر کے علوم کے ساتھ دین کی تعلیم ایک ہی درسگاہ میں دی جانی چاہیئے۔ اور اس طرح مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کے ادارہ (INSTITUTION) کو ختم کر دینا چاہیئے۔

اس کے بعد طلوعِ اسلام نے بتایا کہ ہماری صحیح تعلیم کی اصل و بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں اس نے لکھا تھا،

"اب رہا یہ کہ دین کی تعلیم کی اصل و بنیاد کیا ہو۔ سو اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ دین کی اصل و بنیاد خدا کی کتاب ہے جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے اور جو تمام مسلمانوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن ہی اس مقصد و منتہیٰ کی وضاحت کریگا جس کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہی بتائے گا کہ مسلمان کا فلسفۂ زندگی کیا ہے اور نظریۂ حیات کیا۔ اسی سے متعین ہوگا کہ ملتِ اسلامیہ کا اقوامِ عالم میں مقام کیا ہے اور منصب کیا۔ یہی واضح کریگا کہ مملکتِ پاکستان کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے؟ یہی اس کی پالیسی کو متعین کریگا اور اسی سے وہ شاہراہِ حیات پر راہ نمائی حاصل کریگی۔ اس سے آگے بڑھیئے تو اسی سے وہ کیریکٹر پیدا ہوگا جس کے فقدان کا ہم آج رونا روتے ہیں۔ ذرا سوچیئے کہ قرنِ اول کے جن مسلمانوں

کی سیرت و کردار کو ہم نوعِ انسانی کے لئے بطور معیار اور مثال پیش کرتے ہیں انہیں کس چیز کی تعلیم دی گئی تھی۔ انہیں نبی اکرمؐ نے جو فقید المثال تعلیم دی تھی اسے خود کتاب اللہ نے ان چند الفاظ میں سمٹا دیا ہے۔ کہ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ۔ (۶۲/۲) "وہ قوانینِ خداوندی کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کی ذات کی نشوونما کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انہیں کتاب و حکمت (قانونِ خداوندی اور اسکی غایت و مصلحت) کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وہ قرآنی تعلیم تھی جس نے اس اونٹ چرانے والی قوم کو اقوامِ عالم کی امامت (لیڈرشپ) کا اہل اور مستحق بنا دیا۔ قرآن وہ مستقل اقدار دیتا ہے جن کے احترام اور پابندی میں سیرت کی بلندی اور کردار کی پختگی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی مستقل اقدار وہ حدود ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود وضع کرنے کے مجاز قرار پاتے ہیں۔ انہی کے مطابق وہ معاشرہ متشکل ہوتا ہے جس میں اولاً اس معاشرہ کے افراد کی زندگی اور اس کے بعد پوری نوعِ انسانی کی زندگی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا ہماری تعلیم کی اصل و اساس قرآن ہے۔ قرآنی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ اسی کو حق و باطل اور صحیح اور غلط کا معیار قرار دیا جائے۔ ہماری تاریخ ہو یا سیرت، فقہ ہو یا روایات سب کو قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ اس سے وہ غیر اسلامی پردے اٹھ سکیں گے جو ہماری بدقسمتی سے صدیوں سے حقیقی اسلام کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کئے ہوئے ہیں۔ اور جب تک یہ پردے نہیں اٹھیں گے ہم دین کو اس کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے آج سے یعنی ۱۹۵۱ء سے اکیس سال پہلے واضح الفاظ میں توجہ دلائی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ سر سکندر حیات خان (مرحوم) نے تجویز کیا کہ انٹر کالجیٹ برادرھڈ کی طرف سے علامہؒ کی خدمت میں ایک تعلیمی پیش کی جائے۔ آپ نے یہ کہہ کر اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ "ملت کی ضروریات ایک فرد کی ضروریات سے کہیں زیادہ اہم ہیں؟ اس کے بجائے آپ نے کہا کہ اگر تم لوگوں نے کچھ کرنا ہے تو اسلامیہ کالج میں اسلامیات کی ریسرچ کے لئے ایک ادارہ قائم کرو۔ اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا۔

"آج وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ اسلامی فکر اور نہجِ زندگی کا ان کے حقیقی سرچشمہ کی روشنی میں مطالعہ کر کے قوم کو بتایا جائے کہ دین کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور کس طرح اس کے اہم تصورات و مباحث کا ان پتھریلی تہوں کے بوجھ کے نیچے دب کر گلا گھٹ رہا ہے جو اسلام کے ضمیر پر بُری طرح سے جم چکی ہے ضرورت ہے کہ اس (غیر اسلامی) قشر (CRUST) کو الگ کر دیا جائے تاکہ ہماری نئی نسل کے ضمیر کو آزادانہ فطری نمو کا موقعہ مل سکے۔"

(تقاریر و بیانات علامہ اقبالؒ۔ صفحہ ۲)

حکومت کی طرف سے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں طلوع اسلام نے کہا تھا۔

"یونیورسٹی میں قرآن مجید کی وسیع اور گہری تعلیم دی جانی چاہیئے۔ طلبا کو بتانا چاہیئے کہ اس ضابطہ حیات کی رُو سے زندگی کا منتہیٰ کیا ہے اور اس منتہیٰ کے حصول کا طریق کیا یعنی ایک ایسے معاشرے کی تشکیل جو تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہو۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی (اور اسلامی فکر کی) تاریخ بھی پڑھانی چاہیئے۔ اس کا مطالعہ علم و بصیرت کی روشنی میں کرانا چاہیئے۔ اور تنقید کا مدار خالصتہً قرآن کو قرار دینا چاہیئے یعنی انہیں بتانا چاہیئے کہ ہماری تاریخ میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ حق و صداقت کے مطابق ہے جو قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

اسلامیات کی تعلیم اس انداز کی ہونی چاہیئے کہ جس سے گورنمنٹ اسکولوں اور دینی دارالعلوموں کی ثنویت (DUALISM)

ختم ہو جائے۔ ایک اسلامی حکومت میں اس امر کا تصور ہی تعجب انگیز ہے کہ دینی تعلیم کے لئے الگ مدارس ہوں اور دنیاوی تعلیم کے جداگانہ اسکول۔ یہ تفریق غیر مسلم حکمرانوں کے دور کی یادگار ہے جو اب یہاں سے جا چکے ہیں۔

ہمارے بچوں کی تعلیم خواہ وہ عمومی ہو یا فنی (TECHNICAL) اس میں قرآن کریم کے غیر متبدل قوانین حیات کی حیثیت بنیادی ہونی چاہیئے۔ وہ اصول جو تکریم و حریت آدمیت، فرد کی ذات کی نشوونما — عالمگیر انسانیت کی ربوبیت وغیرہ کا سبق دیتے ہیں۔

جہاں تک تعلیم کے اخراجات کا تعلق ہے طلوع اسلام نے لکھا تھا کہ "تعلیم کی پوری ذمہ داری مملکت کے سر ہونی چاہیئے۔ جب بچوں کی تعلیم مملکت کی ذمہ داری قرار پائے گی تو انفرادی اخراجات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ مملکت کی ذمہ داری میں ہر بچہ وہ کچھ بن سکے گا جو کچھ بننے کی صلاحیت اس میں ہے۔ کسی کی مضمر صلاحیتیں اخراجات کی کمی یا فقدان کی وجہ سے دبی کی دبی نہیں رہ جائیں گی۔ صلاحیت کی نشوونما اس صورت میں دب کے رہ جاتی ہے۔ جب ہر بچے کے ماں باپ کو اس کی تعلیم کا کفیل ٹھہرا دیا جائے (اس صورت میں صرف امیروں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں خواہ وہ دماغی طور پر کتنے ہی نالائق کیوں نہ ہوں اور غریبوں کے بچے اعلیٰ تعلیم کے لئے ترستے رہ جاتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں) لیکن جب پوری کی پوری نسل کی تعلیم کی ذمہ دار اسلامی مملکت ہو جائے گی تو پھر ہر بچے کی تعلیم اس آخری منزل تک پہنچ سکے گی جس تک پہنچنے کی اس میں صلاحیت ہوگی..... جو لوگ دن بھر ملازمت کرتے ہیں وہ عام طور پر اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے مزید تعلیم حاصل کرتے ہیں یعنی تعلیم سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے متوسلین کی ضروریات زندگی کے حصول (یا روپیہ جمع کرنے) کے لئے زیادہ کما سکیں۔ اس تعلیم کا جذبہ محرکہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ اور اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ انسانی ذات کی نشوونما کا خیال اس کا جذبہ محرکہ قطعاً نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے لئے تعلیمی مواقع بہم پہنچانے کے بجائے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ انہیں اس قدر دیا جائے جس سے ان کی ضروریات زندگی پوری ہو جائیں اور وہ اکی خاطر اس طرح پریشان نہ ہوتے پھریں۔ باقی رہا ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما سو اس کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں جن میں وہ اپنے مضمر جوہروں کا مظاہرہ کر سکیں۔

اس کے بعد طلوع اسلام نے لکھا کہ: "یہ ہے ہماری تعلیمی عمارت کا سنگ بنیاد۔ اگر ہم نے فی الواقع ایسا تعلیمی نظام متشکل کر لیا ہے جسے صحیح معنوں میں اسلامی کہا جا سکے تو اس کے لئے پہلا قدم یہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اس تعلیمی کمیشن کے حدود و تحقیق و سفارشات سے باہر ہے جس کا تقرر حال ہی میں کیا گیا ہے۔ اس کے لئے اس کے دائرہ تحقیق کی توسیع یا کسی دوسرے کمیشن کے تقرر کی ضرورت ہے۔ اگر امیانہ کیا گیا اور معاملہ موجودہ نظام کے نظم و نسق میں تغیر و تبدل اور اس کے ٹیکنیکل گوشوں میں اصلاح و ترقی تک محدود رکھا گیا تو (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) اس سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکیں گے جن کی آرزو کے آئینہ دار صدر مملکت کے وہ بیانات ہیں جن کے اقتباسات شروع میں زینت اوراق کئے گئے ہیں۔ (طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۶۰ء)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے نوجوانوں کی جس ذہنی آوارگی کے ہاتھوں ہم اس درجہ نالاں ہیں وہ ایک دن کی پیداشدہ نہیں۔ یہ رفتہ رفتہ اس حد تک پہنچی ہے اور اس کی وجہ تعلیم کے مسئلہ سے ہمارا مجرمانہ تغافل ہے۔ ہمارے یہ موجودہ نوجوان وہی ہیں جو تشکیل پاکستان کے وقت آٹھ آٹھ دس دس سال کے بچے تھے۔ یہ ان کی بارہ تیرہ سال کی غلط تعلیم و تربیت

کا تدریجی نتیجہ ہے جو اب یوں اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زہر صرف موجودہ کھیپ تک محدود نہیں۔ جو بچے ان کے پیچھے آرہے ہیں وہ بھی تو اسی غلط تعلیم کے پروردہ ہیں۔ اس لئے وہ بھی انہی جیسے (بلکہ ان سے بدتر) ہوں گے۔ لہٰذا یہ کانٹے جن کی طرف ہم نے اتنے برسوں تک تغافل برتا ہے معلوم کتنے عرصہ تک ہمارے پاؤں زخمی کرتے رہیں گے۔ ہمیں ان زخموں کی تکلیف کو طوعاً و کرہاً برداشت کرنا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ضروری ہے کہ آئندہ کے لئے ایسا انتظام کیا جائے جس سے یہ صورتِ حالات دوام حاصل نہ کر جائے۔ اس کا علاج صحیح تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں۔ قوم کے بچوں میں کیریکٹر اسی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر سوال سامنے آتا ہے کہ صحیح تعلیم سے کیریکٹر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟ اس سوال کے تفصیلی جواب کے لئے تو بڑی فرصت درکار ہوگی لیکن اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کسی بلند اور اعلیٰ اقدار (VALUE) کی خاطر کمتر درجہ کی قدر کو قربان کر دینا کیریکٹر کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی مروجہ (غلط تعلیم) انسانوں کو محض حیوانی (طبیعی) سطح (PHYSICAL LEVEL) کی زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔ یہ اسے انسانیت کی سطح پر لاتی ہی نہیں اس لئے اس کے سامنے حیوانی سطح سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔ قرآن کریم انسان کے سامنے زندگی کی بلند اقدار رکھتا ہے جن کی خاطر انسان حیوانی سطح کی پست اقدار کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی کو کیریکٹر کہتے ہیں۔ اب اس سوال کا دوسرا حصہ لیجئے۔ یعنی ہمارے نوجوانوں میں بے راہ روی پیدا کس طرح ہوتی اور صحیح تعلیم اس کا علاج کس طرح کر دیگی؟ اس کے لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ افرادِ معاشرہ کو حدود کے اندر رکھنے کے دو طریق ہوتے ہیں۔ ایک کو کنٹرول (CONTROL) کہہ لیجئے اور دوسرے کو ڈسپلن (DISCIPLINE)۔ کنٹرول کے معنی یہ ہیں کہ کسی باہر خارج سے پابندیاں عاید کی جائیں اور اُسے ان پابندیوں پر مجبور کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ انسان ان پابندیوں پر اُسی وقت تک عمل پیرا رہتا ہے جب تک وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو۔ جونہی جبر کی گرفت کمزور ہوتی پابندیاں ڈھیلی پڑنی شروع ہو گئیں۔ اس کے برعکس ڈسپلن وہ ہے جس میں انسان اپنے آپ پر خود پابندیاں عائد کرتا ہے۔ وہ ان پابندیوں کی ضرورت اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے۔ ان کی اہمیت ان کے اعماقِ قلب سے ابھرتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان پابندیوں کی اہمیت کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھے۔ جو پابندیاں اس طرح عاید کی جائیں یعنی وہ (SELF IMPOSED) ہوں انسان انہیں کبھی نہیں توڑتا۔ آپ اپنے بچوں کو دیکھئے۔ جس بچے کو آپ گھر میں جبراً پڑھنے کے لئے بٹھاتے ہیں اس کی ہر وقت یہی کوشش ہوتی ہے کہ آپ ذرا اِدھر اُدھر ہوں اور وہ کھیلنے کے لئے نکل بھاگے۔ اس کے برعکس جس بچے کو احساس ہو کہ اگر اس نے محنت نہ کی تو وہ امتحان میں فیل ہو جائے گا۔ اسے کام کرنے کے لئے کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ (خود زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی میں صرف کرتا ہے۔ کنٹرول اور ڈسپلن میں یہی فرق ہے۔

غلط نظامِ تعلیم میں بچوں کی تربیت کنٹرول کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ ان سے اخلاقی امور حکماً منوائے جاتے ہیں۔ انہیں ان کی ضرورت اور اہمیت (یعنی غرض و غایت) کا دل سے قائل نہیں کرایا جاتا۔ جب ہمارے کالجوں کی تعلیم نے ان نوجوانوں میں تنقید کا مادہ ابھارا تو ان پابندیوں کی غایت ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس لئے انہوں نے انہیں بے فائدہ جکڑبندیاں خیال کر کے ان رسّیوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ اس سے وہ انارکی (ANARCHY) پیدا ہو گئی جس نے ہمارے نوجوانوں کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا۔ کسی نے اس کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ ان کی تربیت ڈسپلن کے طریق سے کی جائے جس سے بلند اقدار کی اہمیت

ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی کی بلند اقدار سامنے نہ رہیں تو انسان حیوانی سطح سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ یہ وجوہات ہیں ہمارے بچوں کی موجودہ آوارگی کے۔

قرآن کریم کی صحیح تعلیم زندگی کی بلند اقدار کو اس طرح اجاگر کرتی ہے کہ انسان انہیں علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتا اور دل و دماغ کے پورے اطمینان سے ان پر کاربند ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے کردار میں وہ ڈسپلن پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی آوارگی (انارکی) پیدا نہیں ہونے دیتا۔ یہی ہے وہ تعلیم جس کی طرف ہم شروع سے توجہ مبذول کرائے چلے آ رہے ہیں اور جس سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ سے معاشرہ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قدر تلخ تجربہ کے بعد بھی ہم اصلاح حال کے لئے کوئی مؤثر قدم اٹھانے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ قوم میں تو ہمیں اس کے لئے کوئی آمادگی نظر نہیں آتی۔ اس لئے ہم اپنی اس درخواست کو پھر دہراتے ہیں جسے ہم نے جنوری ۱۹۵۹ء میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

"ہم صدر مملکت کی خدمت میں باادب لیکن بتاکید گزارش کریں گے کہ وہ قوم اور اسلام کی اس بنیادی ضرورت کو اپنی خصوصی توجہات کا مرکز بنائیں اور اس کے لئے ایسے اقدامات کریں جن سے وہ مقاصد حاصل ہو جائیں جن کا اظہار انہوں نے مختلف مواقع پر کیا ہے اور جن میں مملکت کی سربلندی اور اسلام کی سرفرازی کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر انہوں نے تعلیم کے مسئلہ کو ان خطوط پر سلجھا دیا تو بلاشک و شبہ جریدۂ عالم پر ان کا دوام ثبت ہو جائے گا اور قرطاسِ زمانہ پر ان کا نام سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔"

عزیزانِ گرامی قدر! یہ ہے مختصراً جو کچھ طلوع اسلام نے تشکیل پاکستان کے یوم آغاز سے ۱۹۶۰ء تک اس باب میں کہا اور کیا۔ اس کے بعد بھی اس نے اپنی اس پکار کو برابر جاری رکھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ قوم یا قوم کے نمائندے، اربابِ اقتدار اس طرف توجہ ہی نہیں دیتے تو اس نے ہار تھک کر یہ سوچا کہ دہی بڑے پیمانے پر ایک محدود پیمانے پر خود ہی کوئی عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔ اس کے لئے اس نے ۱۹۶۵ء میں طلوع اسلام کالج کی تشکیل کی تجویز سوچی۔ اس کالج کے نمایاں خط و خال کیا ہیں اور اس باب میں اس وقت تک کیا کچھ ہو چکا ہے اسے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکرٹری صاحب بیان کریں گے کہ وہی اس کے لئے موزوں ہیں۔ میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ والسلام

غلام صابر (ایم۔ اے)

ضمیمہ

صدر محترم و برادران گرامی قدر!

آپ کو معلوم ہے کہ اخبارات کا ایک ضمیمہ یا (SUPPLEMENT) شائع ہوا کرتا ہے۔ میں جو کچھ پیش خدمت کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں اسے اخبار الاسلام کا ضمیمہ سمجھیے۔ اسلام صاحب نے بتایا ہے کہ تعلیم کے مسئلہ سے متعلق طلوع اسلام کی تگ و تاز تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی اور وہ اب تک جاری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسکی

یہ جدوجہد قیامِ پاکستان کے بعد شروع نہیں ہوئی۔ وہ اس سے بہت پہلے اس میدان میں اتر چکا تھا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جب مہاتما گاندھی نے دیکھا کہ دو قومی نظریہ (جو ان کے نزدیک عصرِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ تھا) مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کئے جا رہا ہے تو انہوں نے اسے فرو کرنے کے لئے ایک اور اسکیم سوچی جو اپنی اثر انگیزی اور نتائج خیزی کے اعتبار سے بڑی خطرناک تھی۔ اس کی اسکیم یہ تھی کہ ملک میں ایک ایسا نظامِ تعلیم عام کیا جائے جس سے مسلمان بچے اپنے دین کی عظمت کی طرف سے بالکل بیگانہ بنا دیئے جائیں اور وہ خالص ہندوستانی (یعنی ہندو) بن کر ابھریں۔ اس مقصد کے لئے گاندھی جی نے ایک مکمل سکیم وضع کی اور اُسے ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) کی وساطت سے ملک میں پیش کیا گیا۔ اسے "واردھا کی تعلیمی اسکیم" کہا جاتا تھا۔ ملک میں اس کا بڑا چرچا ہوا اور ہر طرف سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پرویز صاحب کی نگہِ حقیقت شناس نے اس خطرہ کو بھانپا اور اس اسکیم پر ایسی جامع تنقید کی جس نے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اُن کی یہ تنقید طلوعِ اسلام کی اگست ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں شائع ہوئی اور ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ چھ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور ہزارہا کی تعداد میں اس کے پمفلٹ تقسیم ہوئے۔ اس سے اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف یہ کہ مہاتما جی کی وہ اسکیم ہی گاؤخورد ہو گئی بلکہ اس کے نصاب کی جس قدر کتابیں چھپوائی گئی تھیں انہیں ساحلِ بمبئی سے غرقِ سمندر کرنا پڑا۔ پرویز صاحب کی وہ تنقید نہایت پُر از معلومات، حقیقت کشا، بصیرت افروز اور ہندو ذہنیت کی پردہ در تھی۔ اور اس قابل کہ وہ ساری کی ساری پیشِ خدمت سامعین کی جائے لیکن قلّتِ وقت کی بنا پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے میں صرف اس کے تمہیدی الفاظ تک اکتفا کروں گا ..... غور سے سنیئے۔ انہوں نے لکھا تھا :-

" تاریخ عالم کے زمانہ قدیم پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت و سطوت کی مالک قومیں دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قتل و غارتگری اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں۔ چنگیز و ہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحاتِ تاریخ پر خون کے حروف میں لکھی ملتی ہیں۔ فرعون و نمرود، شداد و ہامان کے جور و استبداد کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دورِ جہالت تھا، علانیہ سبعیت و بربریت کا زمانہ تھا۔ عصرِ حاضر کا مہذب انسان اس دورِ وحشت کو سخت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو خدا کی برکتوں اور رحمتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں جس میں اُسے انسانیت تڑپتی بلکتی، پھڑکتی نظر آئے۔ لیکن جو لوگ حقائق اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اُن پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت اور بربادی میں عہدِ جہالت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عہدِ جہالت تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہ سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوشنما نقاب اڑھائے۔ وہ جو کچھ کرتا تھا بتا کر، جتا کر، دکھا کر کرتا تھا۔ لیکن آج انسان عقل و حکمت میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ آج اسی طرح کھلم کھلا اپنی ہوسِ خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب سے زیادہ مدبر، سب سے زیادہ ہوشیار وہ ہے جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک کہیں نظر نہ پڑے۔ وہ دوسروں کی متاعِ حیات کو اس مشفقانہ انداز سے لوٹے کہ اس پر رہزن و قزاق ہونے کا شبہ تک نہ ہو۔ وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے، دریں حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ... کیا ہو رہا ہے۔ دورِ جہالت کا وحشی اور

ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ اس کے جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفان بلاخیز تھیں جو کف بردہاں بڑھتا، اُمنڈتا، بپھرتا چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں اور جس کی شورانگیزیوں کو بہرے بھی سنتے ہیں۔ لیکن دورِ حاضر کے مہذب انسان کی استہلاک و تخریب کی چالیں ایک پُرسکوت دریا کی مانند ہیں کہ جس کی روانی میں نہ شور ہے نہ تموّج۔ لیکن سطحِ آب کے نیچے لیے ایسے خوفناک مگرمچھ ...... چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو تباہ کر دیں لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان سُن سکیں۔ اس پُرسکوت طریقِ تخریب اور آتش خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل ہے۔ آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں نہایت خاموشی سے اُس کے طریقِ تعلیم کو بدل دیجئے ۔۔ وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاکت و بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھنچی چلی جائے گی۔ آپ سے پتہ اس وقت چلے گا جب وہ سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہو گی۔ حضرت اکبر مرحوم نے اس جانکاہ حقیقت کو کس قدر بلیغ اور اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمایا ہے کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی " (طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۳۹ء)

اس تمہید کے بعد انہوں نے بتایا کہ ہندوؤں کی سازش کس قدر گہری ہے جس کی بردمندی کے لئے اس تعلیمی اسکیم کو وضع کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے اس اسکیم کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔

سو مسئلہ تعلیم کے متعلق اس داستانِ جہاد کی ابتدا ۱۹۳۸ء سے ہوئی ہے اور آج تک جاری ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا کہ

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

سو جس استواری کا یہ عالم ہو کہ چونتیس پینتیس سال سے یہ مہم اس ثبات و استقامت کے ساتھ جاری ہو اُس کے "اصلِ ایماں" ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پیرِ جواں ہمت کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے کہ وہ اپنی زندگی کے لئے حسین خوابوں کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ والسلام

ضرورت رشتہ

ایک ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی۔ باسلیقہ، خوب سیرت دوشیزہ (جو یتیم ہے) کے لئے ایک تعلیم یافتہ برسرِ روزگار مستقل اور معقول آمدنی والے لڑکے کا رشتہ درکار ہے۔

خط و کتابت :۔ بنام " م ب " معرفت
ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

شاہد عادل

دیارِ عرب اور عوامی حکومت

عرب ممالک کے ساتھ ہمارے جو دینی، سماجی اور برادرانہ رشتے قائم ہیں ان کی بابت کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نے عربوں کے دشمن اسرائیل کو اپنا دشمن سمجھا اور ابھی تک نہ ہی اسے تسلیم کیا ہے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کا تعلق قائم کیا ہے۔ عرب بھائی بھی ہماری وقتاً فوقتاً امداد کرتے رہتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ہماری ہستی کے دشمن ہندوستان کو اس نظر سے نہیں دیکھتے جس نظر سے ہم اسرائیل کو دیکھتے ہیں اور ہماری انتھک کوششوں کے باوجود جدہ کی گزشتہ اسلامی کانفرنس میں ہندوستان کے خلاف قرارداد مذمت پاس نہ ہو سکی۔ (روزنامہ "مشرق" لاہور بابت ۳ مارچ ۱۹۷۲ء) اس صورتِ حالات میں شاید ہماری اپنی کوتاہیوں کا بھی دخل ہو اور جس منظم طریقے سے ہمیں عربوں میں کام کرنا چاہیئے تھا ویسا نہیں کیا گیا۔ اور ہندوستان نے ہماری اس سستی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں بڑی محنت اور منظم طریقے سے کام کیا۔ تاہم پہلی وقعہ موجودہ حکومت عرب ممالک کے ساتھ تعلقات کو مناسب اہمیت دے رہی ہے اور اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صدر بھٹو نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی اکثر عرب ملکوں کا ایک طوفانی دورہ کیا اور اب پھر دوسرا دورہ کر رہے ہیں۔ (ان سطور کی اشاعت تک وہ اس دورہ سے واپس تشریف لا چکے ہوں گے)

دیارِ عرب میں پاکستان کے خلاف ہندوستان کا پروپیگنڈہ ہی کچھ کم سنگین نوعیت کا نہیں تھا کہ خود ہمارے بعض اہلِ وطن بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ان حضرات کے پروپیگنڈے کا اصل مقصد تو دیارِ عرب میں اپنے لئے کوئی مقام حاصل کرنا تھا لیکن ان کی کوششوں سے بلاواسطہ ہندوستانی پروپیگنڈے ہی کی تائید ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ سارا کاروبار عربی زبان میں ہو رہا ہے اور ہمارے ملک میں عربی رسائل و جرائد منگوانے کا سرے سے کوئی انتظام ہی نہیں کیونکہ ان کا پڑھنے والا ہی کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مفاد پرست لوگ ملکی سالمیت پر اثر انداز ہونے والے غلط پروپیگنڈے سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ کچھ عرصہ پہلے راقم نے کچھ ایسی ہی تفصیلات احباب کے سامنے پیش کیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور پھر ان معلومات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب، محترم محمد حنیف رامے صاحب اور محترم کوثر نیازی صاحب نے ان کی بنیاد پر پریس کانفرنسوں سے خطاب کیا اور اس غلط پروپیگنڈے کرنے والے گروہ یعنی جماعت اسلامی کا تعاقب کیا۔ ایسی ہی کچھ تفصیلات اب پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے دیارِ عرب میں صدر پاکستان کی شخصیت متاثر ہو رہی ہے۔ اور جس کا فوری ادراک ضروری ہے اور خوش قسمتی سے مذکورۃ الصدر صاحبان بھی اب عوامی

حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر پہنچ چکے ہیں اس لیے وہ اس صورتِ حالات کا تدارک کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہیں۔ اس مقصد کے لئے تجاویز مضمون کے آخر میں پیش کی جائیں گی۔

ایک بنیادی حقیقت

آگے چلنے سے پہلے ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دیارِ عرب میں جماعتِ اسلامی اور جناب مودودی صاحب کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ احترام کوئی راتوں رات پیدا نہیں ہوا بلکہ جماعتِ اسلامی کی پچیس تیس سال کی شبانہ روز محنت اور لاکھوں روپے کے اخراجات سے پیدا ہوا ہے۔ قیامِ پاکستان سے بھی کافی عرصہ پہلے جماعتِ اسلامی نے عرب ممالک میں اپنے پروپیگنڈے کے لئے ایک ادارہ (دار العروبۃ) قائم کر دیا تھا جس کا اس وقت ہیڈ کوارٹر جالندھر میں تھا اور اس کے لئے برصغیر کے ایک ممتاز عربی دان محترم مسعود عالم ندوی (مرحوم) کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس ادارے نے عرب ممالک کے دوروں' وہاں کے اہلِ علم سے خط وکتابت اور مودودی صاحب کی کتابوں کے تراجم کے ذریعے وہاں جماعت اور مودودی صاحب کی ساکھ قائم کی۔ اگرچہ مقصد اسلام کی تبلیغ بنایا جاتا تھا لیکن کوششیں دیارِ عرب میں مودودی صاحب کی شخصیت کو ابھارنے پر صرف کی گئیں۔ یہاں تک کہ محترم مسعود عالم ندوی صاحب کے عمر بھر کے رفیق بھی ان کے جانبدارانہ پروپیگنڈے سے سخت ناراض ہو گئے۔ یہاں تک تو پھر بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ محترم ندوی صاحب کسی حد تک انصاف پسند تھے۔ مثلاً اپنی کتاب "نظرۃٌ اجمالیۃٌ" میں برصغیر کی اسلامی تحریکوں کا تعارف کراتے ہوئے جہاں جماعتِ اسلامی کی تعریف کے لئے سوڈیڑھ سو صفحات مخصوص کئے وہاں دوسری اسلامی جماعتوں کا ذکر بھی ایک آدھ صفحے پر کر دیا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد دار العروبۃ پر جانبدارانہ پروپیگنڈہ اس حد تک غالب ہو گیا کہ اس کے دوسرے ناظم محترم محمد عاصم صاحب کو مجبوراً مستعفی ہونا پڑا۔

پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت

برسوں کی محنت اور لاکھوں روپے کے اخراجات سے جماعتِ اسلامی نے دیارِ عرب میں اپنا جو مقام پیدا کیا اس کا کس طرح غلط فائدہ اٹھایا گیا اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایئے کہ یہ جماعت وہاں اپنا تعارف کس طرح کراتی رہی ہے۔ پاکستان میں سنہ ۱۹۷۰ء کے عمومی انتخابات کے لئے جب سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں تو دیارِ عرب میں جماعت کے حق میں یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا۔

"فی طلیعۃ الاحزاب السیاسیۃ الرئیسیۃ فی البلاد وعددھا حوالی ۱۰۰ حزب"

(ماہنامہ رابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ۔ بابت فروری ۱۹۷۰ء۔ ص ۴۳)

(ترجمہ) یعنی جماعتِ اسلامی ملک کی تمام سیاسی جماعتوں میں جن کی تعداد کوئی سو کے لگ بھگ ہے' سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے۔

ایشیا کی سب سے بڑی جماعت

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عمومی انتخابات میں پاکستان کی یہ سب سے بڑی سیاسی جماعت بری طرح شکست کھا گئی۔ لیکن بیچارے عربوں کو کیا معلوم کہ ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس لئے جماعتِ اسلامی اس بری شکست کے بعد ترقی کی نئی بلندیوں پر پہنچ گئی اور اب یہ ایشیا کی سب سے بڑی جماعت بن گئی :-

"ومعلومٌ انّ الجماعة الاسلامیۃ اکبر منظمۃٍ اسلامیۃٍ فی ایشیا۔"

(دعوۃ الحق مراکش بابت نومبر ۱۹۷۱ء - صفحہ ۱۹۸)

(ترجمہ) اور معلوم ہونا چاہیئے کہ جماعتِ اسلامی سارے ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی جماعت ہے۔

مخالفین کا تعارف

اپنے لئے یہ مقام حاصل کر لینے کے بعد دیکھئے کہ یہ جماعت اپنے مخالفوں کے ساتھ کیا کرتی ہے؟ جن حضرات کی دیارِ عرب کے حالات پر نظر ہے وہ جانتے ہوں گے کہ ابھی تک عرب عوام کی غالب اکثریت کمیونزم کی سخت مخالف ہے۔ ان عرب ممالک کو تو چھوڑیئے جہاں ابھی تک ملوکیت قائم ہے خود اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگانے والے ممالک میں بھی یہ لفظ بے دینی کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ قارئین سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ عرب دنیا کے مردِ آہن صدر ناصر (مرحوم) نے بھی اسلامی سوشلزم کے نام پر اصلاحات نافذ کرنے سے پہلے روس سے قریبی تعلقات کے باوجود اپنے ملک کی کمیونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دے دیا تھا۔ روس اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتا تھا اس لئے اس نے مطلق برا نہ منایا اور تعلقات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اسی طرح سوڈان اور دوسرے عرب ممالک میں ہوا۔ اس لئے اگر عربوں کے سامنے کسی شخصیت کو کمیونزم کے داعی کی حیثیت سے پیش کر دیا جائے تو اس کا جو نتیجہ نکلے گا اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وطنِ عزیز میں جب پہلے عمومی انتخابات کے لئے سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں تو جماعتِ اسلامی نے اپنا تعارف جس طرح کرایا تھا اس کی ایک جھلک اوپر گذر چکی ہے۔ اب دیکھئے صدر ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت پیپلز پارٹی کے چیئرمین تھے ان کا تعارف کس طرح کرایا جاتا تھا۔ پاکستان کی سیاسی حالات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:-

وقد اخذ خطباء المساجد فی ایام الجمع یحثون المسلمین علی رفض المبادی الساریۃ التی ینادی بھا امثال ذوالفقار علی بوتو۔ (ماہنامہ رابطۃ العالم الاسلامی فروری ۱۹۷۰ء صفحہ ۸۲)

(ترجمہ) جمعہ کے دن پاکستان کی تمام مساجد کے خطیبوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ کمیونزم کے ان بنیادی اصولوں پر مطلق دھیان نہ دھریں جن کی طرف پاکستان کے سابق وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو جیسے لوگ دعوت دے رہے ہیں۔

پیپلز پارٹی میں انتشار

اب خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی جماعت بھاری اکثریت سے انتخابات میں جیت گئی۔ لیکن اتنی بڑی کامیابی کا ذکر تو کجا کہیں اشارہ تک نہ کیا گیا۔ اس کے برعکس اگر کوئی معمولی سا موقع بھی ملا تو اس پر کیچڑ اچھالنے سے دریغ نہیں کیا گیا جیسا کہ قارئین جانتے ہوں گے عمومی انتخابات کے موقع پر بہت سے لیڈر ایک سے زیادہ نشستوں سے بطور امیدوار کھڑے ہوتے تھے۔ اور پھر ان میں کامیاب ہونے کے بعد زائد نشستوں سے مستعفی ہو گئے تھے۔ ایک ایسی ہی نشست مردان۔ ہزارہ کے حلقہ میں خان عبدالقیوم خان صاحب نے خالی کر دی تھی جس کے لئے ضمنی انتخاب میں دوسری پارٹیوں کے علاوہ پیپلز پارٹی نے بھی حصہ لیا تھا لیکن چونکہ یہ خان عبدالقیوم خان صاحب ہی کا حلقہ تھا اس لئے ان ہی کا نامزدہ مسٹر یوسف خٹک کامیاب ہو گیا لیکن عربوں کے سامنے اسے پیپلز پارٹی کے انتشار اور اس کی شکست کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا۔ دنیائے عرب کے مشہور رسالے دعوۃ الحق مراکش کی اپریل ۱۹۷۱ء کے شمارے میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں:-

انّ حزب الشعب فی غرب الباکستان الّذی یتزعمہٗ ذوالفقار علی بھوتو قد فشل فی الحصول علیٰ معطئ قدم۔ (صفحہ ۱۹۰)

(ترجمہ) مغربی پاکستان کی پیپلز پارٹی جس کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ہیں انتشار کی وجہ سے کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم زیادہ تفصیلات میں نہیں جا سکتے۔ تاہم یہ خیال رہے کہ ہم عربی زبان کے صرف انہی اخبارات و رسائل کے حوالے دے رہے ہیں جو کثیر الاشاعت ہونے کے ساتھ سہل الحصول ہیں بلکہ ساری دنیا میں مفت تقسیم ہوتے ہیں اور ان کا حلقۂ اثر عربوں کے علاوہ تمام دنیا کے مسلمانوں تک پھیلا ہوا ہے۔

صدر یحییٰ کی تعریف

اس کے علاوہ عربی اخبارات میں جماعتِ اسلامی کی جانب سے صدر یحییٰ کی تعریف و توصیف میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا بالواسطہ اثر بھی صدر بھٹو پر پڑتا ہے۔ (ملاحظہ ہو، دعوۃ الحق بابت اکتوبر ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۵۲) اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی کی قراردادوں کو ہی کافی نہ سمجھا گیا بلکہ خود اسی شمارے میں مودودی صاحب نے بھی ان کی تعریف کی کہ وہ اسلامی دستور بنا رہے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ صدر یحییٰ نے ان کی رائے سے موافقت کرتے ہوئے دستور ساز اسمبلی سے دستور بنوانا غیر مناسب سمجھا ہے اور اشارۃً مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اقتدار منتقل نہ کرنے کے فیصلے کی تائید وغیرہ۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بطور صدر پاکستان

آج کے بین الاقوامی معاملات میں ڈپلومیسی ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ سادہ الفاظ میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ چاہے دوسرے ممالک کی جڑیں ہی کیوں نہ کاٹی جا رہی ہوں لیکن ظاہراً ہمیشہ دوستی کا اظہار کیا جائے۔ اور خاص کر اس ملک کے سربراہ کے بارے میں کوئی بھی ناگوار بات نہ کہی جائے۔ لیکن پیپلز پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے دیارِ عرب میں صدر بھٹو کے خلاف جو تأثر قائم کیا گیا تھا پاکستان کی صدارت سنبھالنے کے بعد بھی وہ اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ آزاد اخبارات کو تو چھوڑیئے خود وہ اخبارات جو حکومتوں کی مالی امداد سے شائع ہو کر ساری دنیا میں مفت تقسیم ہوتے ہیں ڈپلومیسی کے ان اصولوں کی پرواہ کئے بغیر صدر بھٹو پر طنز کے تیر برسا رہے ہیں۔ مثلاً صدر بھٹو نے دورہ روس سے واپسی کے بعد قذافی سٹیڈیم لاہور میں جو تاریخی خطاب فرمایا ساری دنیا میں ان کی جرأت کو سراہا گیا لیکن عربی اخبارات میں اول تو اس خطاب کے قابلِ تعریف پہلوؤں کا ذکر ہی نہیں اور اگر مختصر سا ذکر ہے تو طنز کے نشتروں کے ساتھ۔ خطاب کے دوران صدر بھٹو نے جب حاضرین سے لڑنے مرنے کا عہد لیا تو حاضرین نے یک زبان ہو کر اور بڑی گرمجوشی سے لڑنے اور مرنے کا عہد کیا لیکن مکہ شریف سے شائع ہونے والا اخبار العالم الاسلامی اس پر طنز کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

ولکن الرئیس الباکستانی لم یُوضّح مَنْ یُحارِبُ ۔۔۔۔ (نمبر ۲۷، بابت ۲ مارچ ۱۹۷۲ء)

اس طنز میں جو زہر پوشیدہ ہے اس کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی اخبار نے اپنے اگلے شمارے نمبر ۲۸ کے صفحہ آخر پر صدر پاکستان کے خلاف ایک سیاسی تجزیہ شائع کیا، حالانکہ ایک نیم سرکاری اخبار ہونے کی وجہ سے اس میں سیاسی تجزیے شاذ و نادر ہی شائع ہوتے ہیں۔ اس تجزیے کا لبِ لباب یہ ہے کہ صدر پاکستان ہندوستان سے پاکستان کے جنگی قیدی لانے میں اتنے بے چین ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے ملک کی سالمیت کا سودا کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔

ان طنزوں کے ساتھ اگر عوامی حکومت کی بعض اصلاحات کا بھی ذکر ہوتا تو معاملہ برابر سمجھا جاتا لیکن ان کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ بنگلہ دیش میں غیر بنگالیوں پر توڑے جانے والے مظالم تک کا بھی ذکر نہیں ملتا۔

ہندوستان کا کامیاب پروپیگنڈہ

دیارِ عرب میں ہندوستان کے پروپیگنڈے کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے اکثر عرب بھائی مہاتما گاندھی کو مسلمان اور ہندوستان کو ایک اسلامی ملک سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے ہم ماہنامہ دعوۃ الحق کے ایک شمارے سے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہم نے اس ماہنامے کو اس لئے چنا ہے کہ اس کا کافی حصہ عالم اسلامی کی ثقافتی خبروں کے لئے مخصوص ہے۔ اس وقت اس کا مئی ۱۹۷۲ء کا شمارہ راقم کے سامنے ہے جس میں پاکستان کے بارے میں صرف اتنی سی خبر ہے کہ قرطبہ کے میئر نے پاکستان کا دورہ کیا لیکن ہندوستان کے بارے میں اسلامی نوعیت کی چار اہم خبریں دی گئی ہیں پہلی یہ کہ بنارس کی "اسلامی یونیورسٹی" کے علماء کا ایک وفد عرب اور اسلامی ممالک کا دورہ کریگا، دوسری یہ کہ ملیح آباد میں قرآن مجید حفظ کرنے کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی قائم کر دی گئی ہے۔ تیسری یہ کہ دائرۃ معارف العثمانیہ نے ابو عبداللہ ابن محمد بن الحق الشیبانی کی کتاب الحجۃ علی اھل المدینۃ۔ کی تیسری جلد شائع کر دی ہے وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس قسم کی خبروں سے اگر ہمارے عرب بھائی ہندوستان کو ایک اسلامی ملک سمجھ لیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ عام عربوں کو تو جانے دیجئے، وہاں کی سب سے بڑی اسلامی جماعت الاخوان المسلمون کے ترجمان "المسلمون" کے جو شمارے راقم کی نظر سے گزرے تھے ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں مہاتما گاندھی کے اقوال درج نہ ہوں۔

الاخوان المسلمون پر پابندی ختم

جماعت اسلامی کے بالواسطہ پروپیگنڈے کا یہ اثر تو اس وقت ہوا جب مصر کی سب سے بڑی جماعت الاخوان المسلمون خلاف قانون تھی۔ اب صدر سادات نے اس جماعت سے نہ صرف پابندی اٹھائی ہے بلکہ اس کے جو لیڈر ملک بدر کئے گئے تھے انہیں مصر واپس آنے کے لئے ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھیجے گئے ہیں۔ (دعوۃ الحق۔ نومبر ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۸۵) اخوان پر پابندی کے دوران جماعت اسلامی نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ان کی جو حمایت کی تھی اس سے قارئین بخوبی واقف ہوں گے۔ اس سلسلے میں صدر ناصر کے ایمان تک کا فیصلہ کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے اخوان کے جلا وطن لیڈر نہ صرف ان کے مشکور ہوئے بلکہ ہر طرح کی جوابی اعانت بھی کی۔ اور اب تو وہ عرب کے ثقافتی مرکز قاہرہ میں واپس پہنچ چکے ہیں اس لئے جماعت کے اثر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے بلکہ ابھی سے اس کے اثرات ظاہر ہونے شروع بھی ہو چکے ہیں۔ روزنامہ مشرق لاہور مورخہ ۵ مئی ۱۹۷۲ء کے صفحہ اوّل پر یہ خبر قارئین کی نظر سے گزر چکی ہوگی کہ حکومت مصر نے مودودی صاحب کی کتابوں سے وہ پابندی ختم کر دی ہے جو بارہ سال پہلے لگائی گئی تھی۔

تجاویز

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حالات کا تدارک کس طرح ہو سکتا ہے۔ راقم کے خیال میں اس کا بہترین طریقہ وہی ہے جو مغربی ممالک نے مستشرقوں کے روپ میں اختیار کیا اور جس پر اب ہندوستان عمل کر رہا ہے۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ عربی زبان کے ممتاز عالموں کو اپنی طرف سے مالی امداد مہیا کر کے اور عرب ممالک سے وظائف دلا کر بظاہر انہیں تعلیمی مقاصد کے لئے بھیجا جاتا ہے لیکن درپردہ وہ اپنے ملک کے لئے وہ خدمات سرانجام دیتے ہیں جو ان کے سفیر بھی انجام نہیں دے سکتے۔ خود جماعت اسلامی نے بڑی حد تک اسی طریق کار سے فائدہ اٹھایا۔ حکومت سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ اس

وقت دیارِ عرب میں علمی مقاصد کے لئے جانے والوں میں سے زیادہ تر کی ہمدردیاں اسی جماعت کے ساتھ ہیں۔

اس معاملے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ عرب ممالک میں جن حضرات کو سفارتی ذمہ داریاں سونپی جائیں ان کے لئے عربی زبان کا جاننا لازمی ہو۔ اگر سعودی عرب میں ہمارا سفارت خانہ مکہ شریف سے شائع ہونے والے نیم سرکاری اخبار العالم الاسلامی کے اس طنزیہ کا جو اس نے صدر بھٹو کے خطاب لاہور پر کیا تھا کوئی نوٹس لیتا تو ہمیں یقین ہے کہ اسی اخبار کے اگلے شمارے میں صدر بھٹو کے بارے میں جو سیاسی تبصرہ شائع ہوا تھا اس کا لب لہجہ کچھ اور ہوتا۔ اسی طرح عرب ممالک کی طرف بھیجے جانے والے وفود کے بارے میں بھی خاص خیال رکھا جائے۔ اسی سال جدّہ کی اسلامی کانفرنس میں صحافیوں کا جو وفد بھیجا گیا تھا ان میں سے ایک صاحب نے اپنی روئیداد لکھتے ہوئے جُدّہ کے معانی پر عجیب و غریب بحث کی اور آخر اسے جدّہ بمعنی دادی سمجھا۔ حالانکہ یہ لفظ "ج" کے پیش کے ساتھ ہے اور اس کے معنی بالکل مختلف ہیں۔ ان تجاویز کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ پاکستان میں عربی زبان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ (اس سلسلہ میں ہم مفصل تجاویز پہلے ہی طلوعِ اسلام کے صفحات پر پیش کر چکے ہیں)

خدا کرے کہ ہماری ان عاجزانہ سی تجاویز کو در خورِ اعتنا سمجھ لیا جائے اور اس کے مطابق عرب ممالک میں ملک کی ساکھ کو بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

طلوعِ اسلام صدر بھٹو نے حال ہی میں اسلامی ممالک کا جو دورہ کیا ہے اس کے اثرات بڑے خوشگوار مرتب ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے مؤقف کی صداقت سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن ان ممالک سے خوشگوار تعلقات کو محکم طور پر استوار رکھنے کے لئے مسلسل اور متواتر کوشش کی ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت اس باب میں سہل انگاری یا تغافل شعاری سے کام نہیں لے گی کیونکہ مخالف قوتوں نے بڑی سادگی و پرکاری سے اپنے جال دور دور تک پھیلا رکھے ہیں۔ خدا اس مملکت کو ان کی مقدس "ریشہ دوانیوں" سے محفوظ رکھے۔

(پ۔ن)

پرویز صاحب کی وہ معرکہ آراء کتابیں

جن کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو گئے تھے اور اب وہ کسی قیمت پر بھی نہیں ملتی تھیں ان کے تازہ ایڈیشن چھپ رہے ہیں چنانچہ ان میں سے ابلیس و آدم چھپ کر تیار ہو گئی ہے اور جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، من و یزداں وغیرہ رفتہ رفتہ چھپ جائیں گی۔

اگر آپ پیشگی خریداری کی اسکیم میں شامل ہو جائیں تو نہ صرف یہ کتابیں، تیار ہونے پر، بالیقین آپ کو مل جائیں گی بلکہ ان کا ڈاک کا خرچ بھی ادارہ خود برداشت کرے گا۔ پیشگی اسکیم میں آپ ایک سو روپیہ جمع کرا دیجئے۔ آپ کا کھاتہ کھول لیا جائے گا اور جو کتاب آپ چاہیں گے "بلا خرچ ڈاک" آپ کو بھیجدی جائیگی۔ یہ بڑی منفعت بخش اسکیم ہے۔ اس میں ضرور شامل ہو جائیے۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

بسلسلہ فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۷۲ء حسب ذیل عطیات بشکریہ موصول ہوئے۔ فہرست (ب)

۱- بوساطت ڈاکٹر محمد مصطفےٰ ارائیں صاحب - از مزارعین رحیم آباد (ضلع نوابشاہ سندھ) ۱۱۰/-
۲- محترم ظہور الدین بھٹی صاحب - لاہور ۲۰/-
۳- " بشیر احمد صاحب - ملکوال ۲۰/-
۴- " عبدالرحمٰن صاحب - لاہور ۱۲/-
۵- محترمہ بیگم عبدالقدیر صاحبہ - کراچی ۵۰/-

مندرجہ ذیل رقوم محترم ایم - وائی بٹ صاحب آکسفورڈ (انگلینڈ) کی وساطت سے جمع ہو کر اب وصول ہو چکی ہیں۔

۶- محترم ایم - وائی - بٹ صاحب - آکسفورڈ (انگلینڈ) ۱۰۵/-
۷- " وائی - اے - مرحم صاحب " " ۱۰۵/-
۸- " ایم منظور بٹ صاحب " " ۴۲/-
۹- " چوہدری کرم حسین صاحب " " ۲۱/-
۱۰- " غلام سرور صاحب " " ۲۱/-
۱۱- " عبدالمجید صاحب " " ۴۲/-
۱۲- " چوہدری محمد دین صاحب " " ۲۱/-
۱۳- " ضمیر حسین صاحب " " ۱۰/۵۰
۱۴- " چوہدری بانو خاں صاحب " " ۲۱/-
۱۵- " فضل حسین صاحب I " " ۲۱/-
۱۶- " " II " " ۲۱/-
۱۷- " محمد اقبال صاحب " " ۱۰/۵۰
۱۸- " صابر حسین صاحب " " ۲۱/-
۱۹- محترم سلیم شجاع صاحب - آکسفورڈ (انگلینڈ) ۲۱/-
۲۰- " علی مردان خان صاحب " " ۲۱/-
۲۱- " صوبیدار عبدالرحمٰن صاحب " " ۱۰/۵۰
۲۲- " محمد یونس بٹ صاحب " " ۴۲/-
۲۳- " ملک ملازم حسین صاحب " " ۲۱/-
۲۴- " ایم رفیق بٹ صاحب " " ۲۱/-
۲۵- " چوہدری محمد گلزار صاحب " " ۱۰۵/-
۲۶- " محمد اسلم خان صاحب " " ۲۱/-
۲۷- " چوہدری صفدر علی صاحب " " ۳۱/۵۰
۲۸- " محمد شریف صاحب " " ۲۱/-
۲۹- " عبدالحق صاحب " " ۲۱/-
۳۰- " یونس خان صاحب " " ۲۱/-
۳۱- میسرز ایسٹرن گروسرز " " ۲۱/-
۳۲- محترم محمد مہربان صاحب " " ۲۱/-
۳۳- " ایم الطاف صاحب " " ۱۰/۵۰
۳۴- " فضل حسین بٹ صاحب " " ۲۱/-
۳۵- " عالم شیر بٹ صاحب " " ۲۱/-
۳۶- " محبوب بٹ صاحب " " ۲۱/-
۳۷- " گلزار احمد صاحب " ۲۱/-
۳۸- " محمد خان صاحب " ۲۱/-
۳۹- " چوہدری محمد انور صاحب " ۲۱/-
۴۰- " صوفی محمد حیات صاحب " ۲۱/-

نوٹ:- قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس - آر - او نمبر ۶۵/(k)/۷۲/۲۵۴ مورخہ ۴ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ I مورخہ ۵ - ۱۲ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۵/۱۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنےٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

(سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی - رجسٹرڈ) لاہور

○ کیا انسان کی قسمت پہلے سے لکھی ہوئی ہے ؟ ○ کیا سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ؟ ○ کیا غریبوں کی قسمت ہی ایسی ہے کہ وہ ساری عمر دھکے کھاتے رہیں ؟ کیا خدا کو ایسا ہی منظور ہے ؟ ○ کیا دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ اگر نہیں بدلتی تو ہم دعا کیوں کرتے ہیں ؟

یہ — اور اسی قسم کے دیگر سوالات کا تعلق **مسئلہ تقدیر** سے ہے جس نے انسانی ذہن کو ہمیشہ طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا — یہی وہ مسئلہ تھا جسے صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے **کارل مارکس** نے کہہ دیا

مذہب عوام کے لئے افیون ہے!

جناب پرویز نے دنیا کے اس مشکل ترین مسئلہ کو اپنی تازہ تصنیف

کتاب التقدیر

میں قرآن کریم کی روشنی میں اس عمدگی سے حل کر دیا ہے کہ اس کے بعد ذہن میں کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔ کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے جلد مضبوط اور گرد پوش جاذبِ نگاہ۔

قیمت:- **پندرہ روپے** جلد منگا لیجئے

ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور
مکتبہ دین و دانش ۔ چوک اردو بازار ۔ لاہور

○ پاکستان کی بنیاد کیا تھی ؟ ○ بانیٔ پاکستان ۔ اقبالؒ ، اور معمارِ پاکستان قائداعظمؒ نے اس مملکت کا تصور کیا دیا تھا ؟ ○ دو قومی نظریہ کیا ہے ؟ ○ نظریۂ پاکستان نہ کبھی فیل ہوا ہے نہ کبھی فیل ہو سکتا ہے۔
○ پاکستان اب بھی ایک قابلِ فخر مملکت بن سکتا ہے۔

یہ موضوع ہے **پرویز صاحب کی کتاب**

قائداعظمؒ کے تصور پاکستان

کا — جو ابھی شائع ہوئی ہے۔ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ایک نسخہ ہر اس گھر میں ہو جس کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہوں یا کر چکے ہوں۔

آپ اپنی کاپی جلد منگا لیجئے۔ ورنہ پہلا ایڈیشن ختم ہو جائیگا۔

قیمت:- **دس روپے** (علاوہ محصول ڈاک)

ضخامت ۳۲۸ صفحات ۔ بڑی تقطیع ۔ سفید کاغذ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور